ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تہذیبی جریدہ

ISSN 2321-4627

مارچ 2021ء -/15 روپے

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

حضرت احمد حسین امجد حیدرآبادی

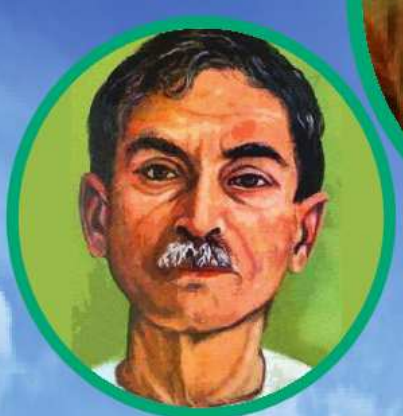

منشی پریم چند

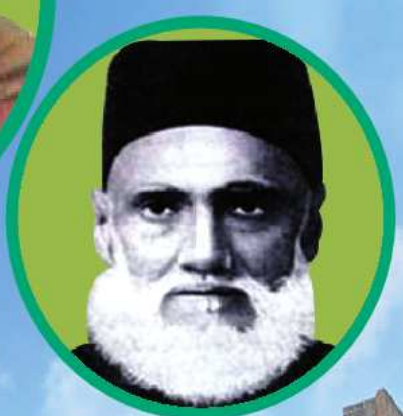

مولانا اسمٰعیل میرٹھی

مدرسہ خواجہ محمود گاواں، بیدر، کرناٹک

جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ''قومی یوم سائنس'' اور ''عالمی یوم مادری زبان'' کے مشترکہ اجلاس سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے۔
شہ نشین پر پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر سید صلاح الدین، ڈاکٹر عابد معز، جناب م۔ق۔سلیم و دیگر احباب دیکھے جاسکتے ہیں

''قومی یوم سائنس'' اور ''عالمی یوم مادری زبان'' کے مشترکہ اجلاس کے موقع پر لی گئی گروپ فوٹو میں جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی، مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ، مہمان مقررین اور اردو اکیڈیمی کے عہدیداران و اراکین عملہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

ماہنامہ
قومی زبان
حیدرآباد
تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، سائنسی و تہذیبی جریدہ
QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 06 شمارہ : 03 مارچ 2021ء

زیرنگرانی : ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری
صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

مدیر : ڈاکٹر محمد غوث
ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Dr. Mohammed Ghouse and Published by Mohammed Ghouse on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana, Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	ڈاکٹر محمد غوث	4
اپنی بات	ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری	5
رباعیات امجد حیدرآبادی		6

مضامین

امجد حیدرآبادی	نصیرالدین ہاشمی	7
مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی تحریروں میں سائنسی اثرات	محمد خلیل سائنسداں	14
ادب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فروغ خواتین کے افسانوں کے حوالے سے	ڈاکٹر آمنہ تحسین	16
اُردو رسم الخط کی تدریس	ڈاکٹر محمد اکبر	22
خواجہ جہاں عمادالدین محمود گاواں کی علمی وادبی خدمات	ڈاکٹر شمس الہدیٰ	26
سرسید اور علی گڈھ تحریک	ڈاکٹر محمد یٰسین	30
حیدرآباد دکن کا تہذیبی پس منظر	نظیر احمد گنائی	35
''راجدیو کی امرائی'' میں صادقہ نواب کی سحرکاری	ڈاکٹر قسیم اختر	44
صادقہ نواب سحر کے ناول ''جس دن سے'' کا موضوعاتی مطالعہ	تبسم حسن	47
راہی فدائی کی نثری تصانیف کا تنقیدی جائزہ	جی بی عائشہ	52
پریم چند کے افسانوں میں مزاحمتی لے	میر محمد عابد	58
ریاست تلنگانہ میں معذورین کے فلاحی پروگرامس کا جائزہ	فرحت سلطانہ	64
مادری زبان کی اہمیت اور سماجی ذمہ داری۔۔رپورتاژ	ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی	70

افسانے

ماں کا دل	عابد محبوب	73
پچھتاوے کی آگ	ثریا جبین	76

حفظانِ صحت

کرونا ویکسین اور جسم کا قدرتی نظام	ماخوذ	79
اپنے آپ کو کیسے فٹ رکھ سکتے ہیں؟	ماخوذ	80

حصہ نظم

غزل	شاہ حسین نہری۔	81
غزل	جمیل نظام آبادی	81
غزل	سردار سلیم۔	82
غزل	علیم پرواز	82

ہم کلامی

مارچ 2021ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے ۔اس شمارے کی ابتداء ہم نے دکن کی مایہ ناز شخصیت' صوفی منش شاعر' سرمدِ ثانی' شہنشاہِ رباعیات حضرت احمد حسین امجد حیدرآبادی کے حالات زندگی پر دکن ہی تعلق رکھنے والے ایک محقق اور استاد جناب نصیرالدین ہاشمی مرحوم کے مضمون سے کی ہے ۔قارئین ومحبان اردو کے علم میں یہ بات لانا سمجھتا ہوں کہ ماہ مارچ جناب امجد حیدرآبادی اور جناب نصیرالدین ہاشمی دونوں کی پیدائش کا مہینہ ہے اور ادارہ قومی زبان تقریباً ہر ماہ اپنے معاصرین و بزرگوں کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے' اسی غرض کے تحت یہ سلسلہ جاری رکھا گیا ہے ۔ بلاشبہ حضرت امجد حیدرآبادی اردو ادب کی ایسی عظیم شخصیت ہیں جن کا نعم البدل ملنا مشکل ہے ۔انہوں نے اپنی زندگی میں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں شاید ہی کسی نے ایسے حالات کا سامنا کیا ہو۔1908 کی طغیانی کے جو حالات ہم نے پڑھے ہیں کہ جو تباہی اس دور میں مچی تھی' اس میں جناب امجد حیدرآبادی اپنے ارکان خاندان کے ساتھ پانی میں غوطے کھا رہے ہیں اور اس دوران ایک کے بعد ایک کر کے ان کی اہلیہ' صاحبزادی اور آخر میں جان سے پیاری ماں پانی میں غرق ہوگئیں ۔ یہ سارا منظر امجد کی نظروں سے گذرا' پھر بھی حواس قائم رہے اور انہوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ان کی شاعری خاص کر رباعیات میں مقصدیت ہے' ان کی رباعیات میں درد' تڑپ اور دعوت فکر ہے ۔ جناب نصیرالدین ہاشمی بھی اردو کے ان مجاہدین میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد تحقیق وتالیف بنایا ہوا تھا' ان کی لکھی گئی کتابوں میں ''دکن میں اردو'' کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے ایک ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل کتاب کے کئی ایڈیشنز ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئے ہیں ۔غرض تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی وقتاً فوقتاً اپنے اسلاف کی یاد کی خاطر اپنے خصوصی شمارے شائع کرتی ہے' مضامین اور مقالات شائع کرتی ہے تاکہ نئے آنے والوں تک ان اسلاف کے کارنامے مشعل راہ بنیں ۔اسی غرض کے لئے اردو اکیڈیمی اپنی معمول کی اسکیمات کے ساتھ دکن کے اردو کی ادبی شخصیات کے کوائف کو مونوگراف کی شکل دینا چاہتی ہے ۔اس سلسلہ میں مشاورت جاری ہے ۔امید ہے کہ بہت جلد اس جانب پیش رفت ہوگی اور اسے ایک دستاویز کی شکل دی جائے گی اور یقیناً یہ اختراعی کوشش اپنے میں منفرد کوشش ہوگی جس سے خواص وعوام بالخصوص ریسرچ اسکالرس کو کافی مدد ملے گی ۔

اس شمارے کے دیگر مشمولات میں دہلی سے جناب خلیل سائنسداں کا مضمون ''مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی تحریروں میں سائنسی اثرات'' بھی شامل ہے جس میں انہوں نے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی کئی نظموں کے حوالے سے اردو ادب میں سائنسی عنوانات واثرات کو ثابت کیا ہے ۔اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر آمنہ تحسین کا مضمون ''ادب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فروغ خواتین کے افسانوں کے حوالے سے'' ڈاکٹر محمد اکبر کی تحریر ''اردو رسم الخط کی تدریس'' ڈاکٹر شمس الہدی کا ''خواجہ محمود گاواں'' پر لکھا مضمون' اسی طرح ریسرچ اسکالرس کے تحقیقی مضامین' عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس کی ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی تیار کردہ رپورتاژ' اس کے علاوہ ممتاز افسانہ نگاروں محترمہ عابدہ محبوب اور محترمہ ثریا جبین کے دلچسپ افسانے' حفظان صحت' اور آخر میں حسب معمول حصہ نظم میں جناب شاہ حسین نہری اورنگ آبادی' جناب جمیل نظام آبادی' جناب سردار سلیم اور جناب علیم پرواز کے کلام شائع کئے گئے ہیں ۔امید کہ قارئین ان نگارشات کو ضرور پسند کریں گے ۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی عالی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب صدر نشین اردو اکیڈیمی کی سرپرستی میں اردو کے فروغ' ترقی اور ترویج کی اسکیمات کی تکمیل میں مصروف عمل ہے ۔سال 21-2020 کی تقریباً اسکیمات کی تکمیل ہوچکی ہے جن میں اردو کے چھوٹے اخبارات کو سالانہ مالی اعانت' اردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت' مطبوعات پر انعامات اور ایسی ہی دیگر اسکیمات شامل ہیں ۔قارئین کو یاد دلاتا چلوں کہ ماہ اکتوبر 2020 میں اردو اکیڈیمی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو اساتذہ کی پانچ روزہ آن لائن تربیتی کلاسس کا اہتمام کیا تھا جو انتہائی کامیاب رہا' اسی سلسلہ کا ایک تربیتی پروگرام اردو اسکالرس کا عنقریب رکھا جائے گا ۔اس کے بعد اردو صحافیوں کا تربیتی پروگرام بھی رکھا جائے گا ۔ بہرحال ہماری کوشش رہے گی کہ اردو کے فروغ کے لئے ہر ممکن طریقہ کار کو اپنایا جائے ۔ ہماری کوششوں میں مزید بہتری آپ سب کے زرین مشوروں سے پیدا ہوسکتی ہے ۔آپ کی آراء کی قدر کی جائے گی ۔

ڈاکٹر محمد غوث
ایڈیٹر

اپنی بات

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی فروغ اردو کی اسکیمات پر عمل پیرا ہے' اور اس کوشش میں ہے کہ اس زبان کو موجودہ حالات کے مطابق سائنس اور ٹکنالوجی سے مربوط کیا جائے ۔ اسی غرض کی خاطر اکیڈیمی نے کچھ نئے اختراعی پروگرام شروع کئے ہیں جیسے اردو سے ناواقف افراد کے لئے مختصر مدتی آن لائن اردو کورس ۔ اس کورس کے بہت دوررس نتائج ظاہر ہوئے ہیں اور سیکڑوں افراد نے اس کورس میں داخلہ لیا ہے ۔ اسی طرح اردو اکیڈیمی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک معاہدہ کیا ہے جس میں اردو اساتذہ' اردو صحافیوں اور یونیورسٹیز کے اردو اسکالرس کی تربیت کا پروگرام ترتیب دیا گیا ہے' ان پروگرامس میں ماہ اکتوبر میں اردو اساتذہ کا پانچ روزہ آن لائن تربیتی پروگرام منعقد ہوا جو نہایت کامیاب رہا' ماباقی پروگرامس بھی امید ہے کہ بہت جلد منعقد ہوں گے ۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ حکومت تلنگانہ نے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کو اردو کی نصابی کتب کی اشاعت کی ذمہ داری بھی دی ہے چنانچہ اس ضمن میں اکیڈیمی نے جنگی خطوط پر سارے ملک میں پہلی مرتبہ ایک اہم اور منفرد کام اردو میڈیم گرائجویشن کی سیاسیات' معاشیات اور تاریخ کی 9 کتابوں کی اشاعت کا کارنامہ انجام دیا ہے' میں اس شاندار کارنامے پر ڈائرکٹر / سکریٹری اردو اکیڈیمی سمیت تمام ایڈیٹرس' مصنفین اور معاونین کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ اسی طرح ہماری کوشش رہے گی کہ اردو میڈیم کے دیگر شعبوں کی نصابی کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں لائی جائے ۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اپنے ترجمان ''ماہنامہ قومی زبان'' کے ذریعہ اردو کے مجاہدین' اساتذہ اور محققین کے کارناموں اور ان کے کوائف آپ تک پہنچاتی ہے' اس کے علاوہ اہم مواقع پر خصوصی شمارے بھی شائع کرتی ہے' اس کے ساتھ ساتھ اکیڈیمی دکن کے معاصرین ادب اور اساتذہ' شعرائے کرام کے مونوگراف شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ اس سلسلہ میں کارروائی جاری ہے ۔ اردو اکیڈیمی نے ایک اور اہم کام نظام سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر کے کارناموں کو ''شوکت عثمانیہ'' کے عنوان سے شائع کر کے کیا ہے' امید ہے کہ بہت جلد اس کتاب کی رسم اجراء عمل میں لائی جائے گی ۔ بہر حال میری کوشش رہے گی کہ اردو اکیڈیمی اردو زبان و ادب کی ترقی' ترویج اور فروغ میں فعال کردار ادا کرے ۔ تمام محبان اردو سے گذارش ہے کہ وہ ہماری کوششوں کا ساتھ دیں اور اپنے زرین مشوروں سے نوازیں ۔

اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام بچوں کا رسالہ ''روشن ستارے'' بھی اپنی ترقی کی منزلوں کو طے کر رہا ہے ۔ میری معلومات کے مطابق اس رسالے کے خریداروں میں روز اضافہ ہو رہا ہے' میری اردو میڈیم کے اساتذہ سے گذارش ہے کہ وہ اپنے اسکولوں میں زیادہ سے زیادہ اس دلچسپ اور معلوماتی رسالے کے خریدار بنائیں ۔

گذشتہ سال سے دنیا کرونا کے قہر میں مبتلا ہے جس میں لاکھوں جانیں جا چکی ہیں' ابھی بھی اس سلسلہ میں خبریں آ رہی ہیں' میری تمام لوگوں سے گذارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں احتیاط کریں اور اس وبا میں ہلاک ہونے والوں کی مغفرت کی دعا اور باقی متاثرین کی خیریت و عافیت کی دعا کریں ۔ ساتھ میں اپنا بہت خیال رکھیں ۔

ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

رباعیاتِ امجدؔ حیدرآبادی

کچھ وقت سے ایک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں ایک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

☆

ہر قطرے میں بحر معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

☆

جو کچھ مصیبتیں ہیں تجھ پر کم ہیں
خوشیاں دنیا کی تیرے حق میں سم ہیں
غم سے کیوں دور بھاگتا ہے امجدؔ
معلوم نہیں تجھے کہ غم میں ہم ہیں

امجد حیدرآبادی

نصیرالدین ہاشمی
حیدرآباد

سن 1911ء حیدرآباد کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہے کہ آصفی فرمانروا میر محبوب علی خان آصف سادس کا انتقال ہوا اور میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع سند نشین ہوئے تھے اور اس سال پہلی مرتبہ شہر حیدرآباد میں طاعونی وبا پھیلی تھی۔

تمام مدارس طاعون کی طویل تعطیلات کے بعد کھلے تھے اور میں اُس وقت مدرسہ دارالعلوم جو مشرقی تعلیم کا مدرسہ تھا پانچویں جماعت میں شریک تھا۔ چونکہ طویل تعطیلات کے بعد مدرسہ کھلا تھا اس لئے جدید ٹائم ٹیبل تقسیم ہوا۔ پانچویں جماعت میں تاریخ دکن اور جغرافیہ دکن کی تعلیم مولوی سید احمد حسین صاحب المتخلص امجدؔ سے متعلق تھی۔ انہی دنوں میں نے حضرت امجد کو پہلی بار دیکھا تھا۔ تیس بتیس سال کے جوان، لمبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، ترکی ٹوپی، حیدرآبادی دوہرا پاجامہ، سلیم شاہی چڑھاواں، یہ تھے امجد صاحب۔ اس وقت امجد صاحب ٹریننگ اسکول کی تعلیم کے بعد اپنی ملازمت پر مدرسہ واپس آئے تھے۔ بعض لڑکے ایسے تھے جو اس سے پہلے امجد صاحب کے زیر درس رہ چکے تھے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ لڑکوں کو بڑی شفقت سے پڑھاتے ہیں اور یہ بھی کہ موسیٰ ندی کی طغیانی 1908ء میں اُن کی بی بی، بچی اور ماں وغیرہ نذر سیلاب ہو چکے تھے۔ اب درگاہ شاہ خاموش کے سجادہ نشین سید محمد ہاشم حسین صاحب کے پوتے سید صابر حسین کو پڑھاتے ہیں، شاعر ہیں۔ قوال ان کی تضمینیں گاتے ہیں، حسن پرست ہیں۔ یہ تھیں وہ معلومات جو مجھے لڑکوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کے حالات قلمبند کرنے سے پہلے امجد صاحب کے جو حالات، بچپن، تعلیم اور آغاز ملاقات سے متعلق ہیں خود اُن کے قلم سے حسب ذیل ہیں:

''ہم نے اپنی والدہ صوفیہ مرحومہ سے سنا تھا کہ نواب سالار جنگ اول کی وفات 1300ھ کے پانچ یا چھ سال بعد حیدرآباد دکن ں 6 رجب کو قریب صبح روز دوشنبہ ہماری نحوست کا ستارہ طلوع ہوا یعنی ہم بمعنی غم پیدا ہوئے۔ صحیح تاریخ و سن ہم کو بھی نہیں معلوم۔ ہمارے والد حضرت صوفی رحیم علی صاحب مرحوم کا ہماری والدہ سے عقد سے تین سال بعد عین ہمارے چھلہ کے دن مرض فالج سے آناً فاناً انتقال ہو گیا۔ چھلہ کی رسم میں مہمانوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا۔

اگرچہ ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے، شوہر کا سایہ بھی سر پر باقی نہ رہا تھا۔ سب بچے جا کر ہم اکیلے رہ گئے تھے مگر نہ معلوم ہماری ان امی جان میں تعلیم کا شوق کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بار بار فرماتیں ''بیٹا! اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ''۔

ماں علم کی دلدادہ، ہم کھیل پر آمادہ، ان کو علم سے محبت، ہم کو پڑھنے سے وحشت۔۔۔ غرض اسی طرح جان چرا چرا کر مار کھا کھا کر خانگی طور پر قرآن مجید اور اُردو کی دو ایک کتابیں اُلٹی سیدھی ختم کر لیں۔ جب مدرسے میں شریک ہوئے ان حیلے بہانوں کی چنداں ضرورت نہ پڑی۔ کتابوں کا بستہ بغل میں دبا کر شوقین بچے کی طرح گھر سے نکل جاتے۔ باغوں اور جنگلوں کی سیر کیا کرتے اور پھر عصر کے وقت اسی طرح بستہ بغل میں لئے ہوئے گھر واپس آ جاتے۔ آخر ایک دن ہماری والدہ کو ہماری آوارہ گردی کا پتہ چل ہی گیا۔ ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے۔ پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ والدہ نے ہم کو بلا کر دِکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو۔ ایک آدمی سوار ہے ایک پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے۔ ہم نے کہا پالکی میں سوار کی۔ والدہ نے کہا ایسی زندگی تو بغیر تعلیم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ وقت کی بات گفتگو کا اثر۔ اس بیش بہا مثال سے ہم سہم گئے اور آئندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا:

دل پہ لگی جا کے ہتھوڑے کی طرح
کہنے کو ظاہر میں وہ اک بات تھی

مضامین

کردیا دم بھر میں ادھر سے اُدھر
بات تھی یا کوئی کرامات تھی

پھر مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے ۔قیام بھی مدرسہ کی بورڈنگ میں تھا۔قیام کے آخری زمانے میں ہم نے پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔خفتن اورخوردن دو ہی مصدر خوب ازبر تھے۔آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو ہماری بے مہاری کی خبر ہوگئی۔اگر چہ مدرسہ کے اعتبار سے ہمارا حصہ فوراً بند ہوجانا چاہیے تھا مگر مہتمم صاحب ہماری رو براہ ہونے کی امید پر کچھ دنوں ٹالتے رہے۔آخر ایک دن مدرسہ کے بڑے ہال کے سامنے ہم کو روک کر پوچھ ہی بیٹھے کہ تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ہم نے کہا کس سے پڑھیں؟ مہتمم صاحب نے کہا تمہارے پڑھنے کے لئے استاد نہیں ہیں؟ ہم نے کہا ان معمولی استادوں سے ہم نہیں پڑھ سکتے۔مہتمم صاحب نے کہا پھر کس سے پڑھو گے؟ ہم نے کہا مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے۔مہتمم صاحب نے کہا ''تمہارے لئے اتنی بڑی ماہوار کا استاد تو نہیں رکھا جاسکتا''۔ہم نے کہا ''تو پھر ہم نہیں پڑھ سکتے''۔ہمارے اس جواب پر مہتمم صاحب کو سخت غصہ آیا اور جھلا کر ہم کو پکڑنے اور مارنے کے لئے لپکے۔

ہم تقریباً 1316ھ میں مدرسہ نظامیہ کے وظیفہ خواروں میں شریک ہوئے ۔وہاں قطبی تک تعلیم پاکر چھوڑ دیا۔اب تک والد مرحوم کے پس انداز اور ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے۔دوروپے ماہوار پر ایک لڑکی کو پڑھانے کیلئے چار میل دور جایا کرتے تھے۔سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی لڑکی سے پہلی شادی ہوئی جس سے ایک لڑکی علیم النساء پیدا ہوئی ۔اس کے دوسال بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر ہم بنگلور چلے گئے۔

۔۔۔نئے ملک میں کہیں ٹھہرنے کو جگہ نہ ملی۔مجبوراً کنٹونمنٹ کے عیسائی مشن میں اُتر پڑے۔مشن اسکول میں تعلیم دیا کرتے تھے' نئے کرسچنوں اور پادریوں سے دن رات مذہبی گفتگو رہا کرتی تھی۔پادری صاحب اتوار کے دن جب سٹی میں وعظ کرنے کے لئے جاتے تو ہم بھی اُن کے ساتھ جایا کرتے تھے۔بڑا لطف تو یہ تھا کہ ایک طرف پادری صاحب کھڑے ہوئے عیسوی راگنی بجاتے' دوسری طرف اُن کے مقابل ہم دین محمدی کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔کام ختم کرکے ہم دونوں پھر ایک ساتھ گاڑی میں سوار ہوکر مشن کو واپس آتے۔ہماری اس طرز روش سے سارے مسلمان بنگلور میں متحیر تھے۔کوئی ہم کو عیسائی کہتا کوئی محمدی سمجھتا۔۔۔

پریشانی کی حالت میں ایک جنٹلمین امیر عبداللطیف صاحب کے گھر پہنچے' انہوں نے قصیدہ سن کر بڑی تعریف فرمائی۔ہماری دعوت کی' کچھ روپے بھی دیئے اور ایک سفارشی چٹھی ایک پارسی ڈاکٹر کے نام لکھی جس کا مضمون یہ تھا:

''آپ کو اپنی تعلیم کے لئے ایک مدرس کی ضرورت تھی۔حامل ہذا آپ کو اچھی طرح تعلیم دے سکیں گے''۔

ہم دوسرے دن پتہ پوچھتے اپنے پھٹے پرانے لباس میں ڈاکٹر صاحب سے مکان پہنچے۔عالی شان مکان کی شان دیکھ کر باہر ہی ٹھٹک کر رہ گئے ۔اتفاق کی بات اس وقت ڈاکٹر صاحب باہر چمن کی روشوں میں سگار کے کش لگاتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ہم کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر پوچھا۔وِل! تم کون ہے؟ ہم نے جواب دینے کی جگہ گھبرا کر چٹھی ہاتھ میں دے دی۔ڈاکٹر صاحب نے لفافہ کھول کر چٹھی پڑھی۔چٹھی پڑھتے ہوئے کبھی سر سے پاؤں تک ہم کو دیکھتے ۔کبھی بھویں چڑھا کر چٹھی پڑھتے۔ہم اس وقت ریش و بروت سے بھی معرا تھے۔آخر ڈاکٹر صاحب سنبھل نہ سکے۔نہایت خشم ناک لہجے میں گرم ہوکر فرمایا۔تم ہم ساٹھ برس کے بڈھے کو تعلیم دے گا۔ہم نے کچھ جواب نہ دیا۔پھر ڈاکٹر صاحب نہایت سختی سے ہمارا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر لے گئے ۔مکان اگر چہ حقیقت میں جنت کا نمونہ تھا مگر ہمارے لئے تو جہنم سے بدتر تھا۔ہم کو لے جاکر کتب خانے میں بٹھایا۔کلیات فانی نکال کر لائے اور ایک قصیدہ پڑھنے کا حکم دیا۔دو چار شعر پڑھ دیئے۔حکم ہوا اس کی تقطیع کرو۔ہم نے تقطیع کردی۔حکم ہوا بحر کا نام بتاؤ۔اب تو ہم بھی غوطہ کھا گئے۔یکا یک دیکھا کہ کتاب کے حاشیہ

مضامین

پر کچھ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ ہم نے ایک ایک حرف پڑھ کر سب کو جوڑ کر بحر اخرب کہہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں اپنی لیڈی صاحبہ سے بھی ہماری بہت تعریف کی' کیونکہ اثنائے گفتگو میں لیڈی صاحبہ مسکرا کر محبت اور قدردانی کی گرم جوش نگاہوں سے ہم کو دیکھ رہی تھیں:۔

نگہے نیاز بود و در فتنہ باز بود

شاہنامہ پڑھانے کے لئے ہم کو اپنا منشی مقرر کرلیا۔

پھر عبداللطیف صاحب کے توسط سے ناظم تعلیمات بنگلور کے پاس پہنچ گئے اور اسی دن سٹی ہائی اسکول میں بالفعل پندرہ روپے ماہوار کے مدرس ہوگئے۔ ہم دو مہینے تک سٹی ہائی اسکول میں مدرسی کرتے رہے۔ کئی انسپکٹر تعلیمات اور پرنسپل ہمارے شاگرد ہوگئے۔ رہنے کو مدرسہ ہی کا دلچسپ اور پُر فضا مکان' پڑھنے کے لئے مدرسہ کا سارا کتب خانہ' خدمت کے لئے مدرسہ کے طلبا' کھانے کے لئے قدردانوں کی ضیافتیں' دل بہلانے کے لئے دوستوں کے ساتھ باغوں کی تفریحیں' رقص و سرور کے جلسے' غرض وہ تمام سامان جو دنیوی مسرت کو مکمل کرسکتا ہے' وہاں پردیس میں خدائے تعالیٰ نے ہمارے لئے فراہم کردیا تھا۔

اس طرح تین چار مہینے بنگلور میں گذار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد واپس ہوئے۔ یہاں آکر چند مہینوں کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کی علمی قدردانی کی شہرت سن کر ایک دن ان کے مکان پہنچ گئے اور رُباعیاتِ امجد کی ایک جلد پیش کردی۔ مولوی عزیز مرزا ہمارے حال پر بہت مہربان ہوگئے اور ہمیشہ قدردانی فرماتے رہے۔ آپ ہی کی سفارش سے ابتداءً ہم مدرسہ دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر مدرس ہوگئے۔

ہمارا مکان موسیٰ ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ سلخ شعبان 1326ھ کی شام ہی سے رودِ موسیٰ لبریز ہوکر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیل بلا کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کے دس بجے تک تو بڑھتے ہوئے پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قبلہ رُخ کی دیوار شق ہوئی۔ کمرے میں پانی آگیا۔ ہم ادھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا بیٹھے۔ اُدھر بھی دم نہ لینے پائے تھے کہ صحن کا پانی دروازے کے راستے بڑھتا ہوا اوپر آگیا۔ آخر ایک تخت بیچ میں ڈال کر ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے لئے یہ بہت نازک وقت تھا۔ دونوں طرف سے پانی برابر چڑھتا اترتا آرہا تھا۔ نہ اِدھر کوئی راستہ نہ اُدھر کوئی مفر' اِدھر موت اُدھر ملک الموت۔۔۔۔

ہم ایک طرف' ماں ایک طرف' بیوی ایک طرف' بچی ایک طرف' مجتمع عناصر اربعہ منتشر ہوگئے۔ اس جگہ بھی قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہمارا قدم ڈوبنے کے بعد زمین کی جگہ گھاس کے چھپر پر جا پڑا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کچھ وقت اسی چھپر پر گذر گیا۔ مگر کس طرح گذرا۔

''سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری''

یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہوگئی۔ اس ہولناک بیداری سے رات کا متوحش خواب ہی غنیمت رہے گا۔ یعنی صبح کے وقت ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصہ گر پڑا۔ فصیل گرنے کی وجہ سے اس کا سمٹا ہوا زور دور دور پھیل کر ہماری طرف بھی منتقل ہوگیا۔

ماں نے بیٹے کی آواز سن لی۔ اسی عالم بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈالی پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ہائے بیٹا! میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی)۔ ہم نے کہا خیر جو ہوا ہوا۔ تم تو کسی طرح بچ جاؤ۔۔۔ اور وہ پتلی سی ڈالی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اماں کے دو چاندوں کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ ہم ننگ خاندان' خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے ڈوبتے ندی کے زبردست دھارے میں بہتے چلے' اسی دھارے میں کچھ دور بہنے اور زنانہ ہسپتال کے محاذی میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کرکے ڈوبتے کو بچالیا۔ بے غیرت کی بلا دور۔ عزیزوں کو کھو کر ننگے' دھڑنگے' بھیانک صورت' ڈراؤنا چہرہ لئے جل مانس بنے ہوئے ایک مرتبہ پھر کنارے تو لگ گئے اور بہنے والے بہہ گئے۔ ڈوبنے والے ڈوب

مضامین

گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا:

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا
عرفات محیطِ غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجدؔ
غیرت والے کو ایک چلّو بس تھا

یہ تھے امجد صاحب کی زندگی کے وہ حالات جو میرے ملنے سے پہلے گذر چکے تھے۔ مدرسہ دارالعلوم کی پانچویں اور چھٹی جماعت میں میں امجد صاحب کا شاگرد رہا۔ خصوصاً چھٹی جماعت میں تو تقریباً تمام مضامین یعنی عربی، فارسی، حساب، تاریخ، جغرافیہ سب کا امجد صاحب ہی درس دیتے تھے۔ آپ کی تعلیم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دوسرے مدرسین کے قطع نظر مکان سے تیار ہوکر مطالعہ کرکے آتے تھے۔ ورنہ اس زمانے میں مدرسہ کا کوئی مدرس ایسا نہیں ہوتا تھا جو درس دینے سے پہلے تیار ہوکر آتا ہو۔ یہ ہی وجہ تھی کہ لڑکے دیدگی سے امجد صاحب سے پڑھنے کی خواہش کرتے تھے۔

پھر وہ زمانہ آیا جب کہ حضرت امجد مدرسہ دارالعلوم کی مدرسی سے نکل کر صدر محاسبی تصفیہ مقدمات کی شاخ میں چلے گئے اور ہم دارالعلوم کی اصلی جماعتوں میں شریک ہوئے، لیکن امجد سے جو انسیت پیدا ہوگئی تھی اور خلوص ہوگیا تھا، وہ منقطع نہیں ہوا۔ نہ صرف باقی رہا بلکہ رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا ہم ہفتہ میں دو مرتبہ بلاناغہ امجد صاحب کے مکان کو جاتے رہے اور کبھی امجد صاحب بھی چار چھ روز ہمارے مکان میں اپنے متعلقین سمیت قیام کرتے یا میرے بیوی بچے امجد صاحب کے مکان میں جارہتے۔ میری بیوی امجد صاحب کی مرید ہوگئی تھیں۔ امجد صاحب کی بی بی کا پردہ مجھ سے نہیں تھا۔ کبھی میری موٹر میں امجد صاحب تنہا کبھی معہ زنانہ سیر و تفریح ملنے ملانے کو بھی جایا کرتے۔ غرض کہ مجھ میں اور امجد صاحب میں باہمی یگانگت ہوگئی تھی۔ اس طرح مجھے امجد صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح ان سے ملنے اور استفادہ علم کے جو مواقع حاصل ہوتے رہے انہیں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

امجد صاحب جس وقت مدرسہ دارالعلوم سے صدر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہوئے اس وقت ان کو تھرڈ گریڈ میں لیا گیا تھا یعنی (40 تا 80) ماہوار تنخواہ تھی پھر سکنڈ گریڈ (100 تا 170) اس کے بعد فرسٹ گریڈ (180 تا 300) پر ترقی ملی اور ملازمت کے آخری زمانے میں (350 تا 600) کے مددگار ہوگئے تھے۔ چار سو سے زیادہ ماہوار پر آپ کو وظیفہ ملا۔ آپ کے افسر ہمیشہ آپ کا ادب کرتے تھے کیوں کہ آپ کی شخصیت مہشور و معروف ہوتی چلی جارہی تھی۔

سیلاب رود موسیٰ کی تباہی کے کئی سال بعد تک آپ نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ اس کے بعد مولانا سید نادرالدین صاحب کی دختر جمال النساء سے عقد ہوا۔ امجد صاحب کی یہ بی بی اپنی روحانی قوت میں امجد صاحب سے ترقی کرگئی۔ ان کے مشاہدات اور مکاشفات ''جمالِ امجد'' میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک درس رکھتے ہیں جن کی صراحت یہاں غیر ضروری ہے۔ میاں بیوی کی زندگی بڑی پرلطف گزرتی رہی جس کی تفصیل خود امجد صاحب نے ''جمالِ امجد'' میں کردی ہے۔ اس کی پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں:

''شادی کے پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ وقت آگیا، رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ خدا اور رسول کی محبت کے آثار سلمیٰ کے (جمال النساء بیگم کو امجد صاحب نے سلمیٰ کا لقب دیا تھا) اوضاع و اطوارات ظاہر ہونے لگے۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب، ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا کیونکہ وہ لطائف و نکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آتے تھے، ان کی زبان سے بلاتکلف ادا ہوتے تھے، کبھی کبھی پکانے کے لئے بھی وقت نہ ملتا۔ بازار سے روٹی لاکر کھالیتے۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں۔ کبھی کبھی اُدھر سالن چولھے پر چڑھا ہوتا، اِدھر کوئی بحث چھڑ جاتی۔ سالن پک پک کر ٹھنڈا بھی ہوجاتا مگر یہاں سلسلہ گفتگو ختم ہی نہ ہونے پاتا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ایک ہی

مضامین

سالن پکا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایک ہی سالن دو دو تین تین دن تک برابر کھاتے رہتے' لذت میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر لقمہ پہلے لقمہ سے لذت میں ترقی کرتا جاتا تھا۔ خانۂ خدا کے زیر سایہ ''صابر منزل'' کے چھوٹے اور پُر فضا چمن میں ہم دونوں کی پر لطف زندگی بسر ہوتی تھی''۔

امجد کی زندگی کے کئی سال جمال النساء بیگم سلمٰی کے ساتھ ہنسی خوشی بسر ہوئے۔ دونوں مل کر حج کو گئے۔ حجِ امجد میں امجد صاحب نے دلچسپ اور دلکش انداز میں اپنے سفر حج کا حال لکھا ہے۔ واپسی حج کے کچھ عرصہ بعد جمال النساء کا انتقال ہوگیا۔ یہ انتقال امجد کی زندگی کا نہایت اہم اور پُر دور واقعہ تھا۔ موسی ندی کے سیلاب کی طرح یہ واقعہ امجد صاحب کے لئے اندوہناک اور پُر الم ہوا۔ عرصہ تک امجد صاحب نہایت سنجیدہ رہے' آخر دوستوں نے شادی کردی مگر امجد صاحب کی نفاست پسند طبیعت نے اس بی بی کے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا نہ کیا۔ ان کو روز اول ہی طلاق دے دی اور ایک عرصے بعد چوتھی بی بی سے عقد کیا جو اس وقت آپ کی شریک حیات ہیں۔

امجد صاحب کی خانگی زندگی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے اب تک بہت کم فرق ہوا ہے۔ جو لباس و خوراک ابتدائی دور میں آپ پہلے بیس روپے ماہوار کے وقت استعمال کرتے تھے وہی چھ سو روپے کی ماہوار کے وقت استعمال کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں۔ سفید خاکستری رنگ کی شیروانی اور ترکی کلاہ کا استعمال تھا۔ حج کے بعد کپڑے کی عربی کلاہ استعمال کرتے ہیں۔ حیدرآبادی دوہرا پاجامہ باہر جاتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ مکان میں تہہ بند اور قمیص کا استعمال ہوتا ہے۔ چڑھاوے کا جوتا پہنتے ہیں۔

امجد صاحب نہایت سادگی پسند ہیں' کھانے پینے' رہنے سہنے' پہننے اوڑھنے میں انتہائی سادگی ہوتی ہے۔ جو مل جائے وہ پہننا آپ کی عادت ہے' ضروریات زندگی کی ہر چیز اکثر خود خریدتے ہیں اور کھانے پینے کے بعد آپ کی خانگی زندگی یا گھریلو معاشرت کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

ہم کو جمال النساء بیگم مرحومہ کے زمانے میں قریب سے امجد کی زندگی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر موجودہ رفیقِ حیات کے ساتھ آپ کی منزلی زندگی کا نقشہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی زندگی خوش و خرم طور پر بسر ہوتی ہے۔ اگرچہ آپ کی رفیق حیات تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ آپ سے بہت چھوٹی ہیں مگر ان کی سلیقہ شعاری اور شوہر کی طبیعت میں خود کو ڈھالنے کے باعث دونوں مسرّت آمیز زندگی گذارتے ہیں' دونوں میں انسیت ہے' محبت ہے' خلوص ہے' شوہر بی بی کی رعایت اور ناز برداری کرتے ہیں تو بی بی شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کو افضل سمجھتی ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے کبھی دونوں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نامناسب بات ہوجائے تو دونوں چشم پوشی کرتے ہیں۔ امجد صاحب نے اپنی بی بی کو قانون اسلامی کے مطابق آزادی دے رکھی ہے۔ امجد صاحب کے بعض خاص خاص دوستوں سے وہ پردہ نہیں کرتیں۔ ہر وقت ان سے بات چیت کی پوری اجازت ہے۔ پہننے اوڑھنے اور آرائش میں آزادی ہے' جانے آنے میں پابندی نہیں۔ حسب استطاعت ان کی فرمائش کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات کی چیزیں بخوشی فراہم کی جاتی ہیں۔ نرمی' شفقت اور ملائمت سے گفتگو فرماتے ہیں۔ خوش مذاقی' خوش طبعی میں ہوتی ہے۔ کبھی خانہ داری کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ دونوں مل کر پکاتے ہیں۔ اسی طرح بی بی بھی آپ کی راحت' آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتی ہیں۔ فرمائش نہیں کرتیں۔ سکھ چین سے زندگی بسر کرنا دونوں کا معمول ہے۔ غرض دونوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب خوش قسمت ہیں کہ آپ کی منزلی زندگی نہ صرف آرام و آسائش میں بسر ہوتی ہے بلکہ قابل رشک ہوتی ہے۔ ورنہ اکثر ادیبوں' شاعروں کو اپنی شریک حیات سے کوفت اور تکلیف ہوتی ہے۔ راحت و چین نہیں ملتا۔

امجد صاحب اگرچہ ایک عرصہ تک تنگ دست رہے مگر وہ خوددار شخص ہیں کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے۔ خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ خاکساری اور فروتنی بھی ہے۔ آپ کے یہاں

مضامین

حیدرآباد کی بڑی بڑی شخصیتیں مثلاً سر امین جنگ مرحوم، سر اکبر حیدری مرحوم، مہدی یار جنگ مرحوم وغیرہ بھی آتے رہے ہیں اور چھوٹے آدمی بھی۔ آپ دونوں سے اخلاق و مروت سے پیش آتے ہیں۔ بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کی بے جا عزت نہیں کرتے اور چھوٹی شخصیت کی توہین روا نہیں رکھتے۔

آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ مہینوں مہمان داری کرتے ہیں، جو خود کھاتے ہیں وہی مہمان کو کھلاتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہے۔ عام طور سے آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے مگر جب تعلقات ہوجاتے ہیں تو ان سے ترک تعلق پسند نہیں کرتے۔ حتی الامکان سابقہ تعلق کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تواضع اور انکساری کی صفت امجد صاحب کے خاص جوہر ہیں۔ غریبوں سے خندہ پیشانی سے ملنا، ان کی دستگیری کرنا آپ کا معمول ہے۔ مجلس میں صدر پر بیٹھنا یا صدر بننا پسند نہیں کرتے۔

امجد صاحب کے ملنے والوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دونوں صنف اور ہر طبقہ کے لوگ آتے ہیں اور ان میں جہاں اعلیٰ عہدہ دار، جاگیردار، وکلاء، تجارت پیشہ ہیں وہاں اہلکار، جز معاش مفلس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کا ہر ملنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ میں ہی زیادہ دوست ہوں۔ امجد صاحب نہایت نرم دل ہیں۔ دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر خود بے چین ہوجاتے ہیں اور جہاں تک ہوسکے مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ کوئی حاجت مند آپ کے گھر سے محروم نہیں جاتا۔ تعصب آپ میں نہیں ہے۔ ہر قوم کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ نام و نمود کی خواہش نہیں ہے۔ آپ کی تصانیف نظم و نثر کی وجہ سے جو شہرت ہے اس سے آپ میں شیخی نہیں ہے۔ دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی اور اگر آپ اس کی خواہش کرتے تو کم از کم ہزار روپے کا گریڈ ملنا آسان تھا کیوں کہ سر اکبر حیدری جیسا شخص آپ کی خاطر داری کرتا تھا اور آپ کی خواہش کی تکمیل ضروری تصور کرتا مگر آپ نے اس کو پسند نہ کیا۔ مروت بھی آپ کا ایک خاص جوہر ہے۔ وقت بے وقت لوگ آتے ہیں اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں مگر آپ سے محض دل آزاری کے خیال سے، یہ نہیں ہوتا کہ اُٹھ کر چلے جائیں۔

امجد صاحب عورتوں کے بڑے حامی ہیں۔ آپ کے پاس اپنا دکھ درد کہنے والی بیسیوں عورتیں اکثر آتی ہیں اور آپ ان کی ہر طرح مدد فرماتے اور میاں بی بی کی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

امجد صاحب ایک فقیر منش اور صوفی ہیں۔ خاص خاص لوگوں کو مرید کرتے ہیں مگر عام طور پر ہمارے یہاں کے مشائخ طریقت اور مرشد اور مرید سے جس طرح پیش آتے ہیں، مشائقین طریقت کا جو عام طریقہ اور رواج نظر آتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

امجد صاحب سینما بھی دیکھا کرتے ہیں۔ اکثر المیہ اور درد ناک فلم دیکھتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مجلس سماع سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ مجلس سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں، البتہ رو لیا کرتے ہیں۔ بعض طوائفیں خصوصیت سے آپ کو آپ کا کلام گا کر سناتی ہیں۔

کسی شخص کی زندگی پر نظر ڈالنے کے لئے اس کے ماحول اور گرد و پیش کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں قائم ہوئے عرصہ ہوچکا تھا اور ان جامعات سے مرد تو مرد خواتین بھی اعلیٰ ڈگریاں لے کر میدانِ عمل میں بازی لے جارہی تھیں۔ مگر حیدرآباد پر جمود طاری تھا۔ مغربی علوم سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مشرقی علوم کی طرف لوگوں کی طبیعتیں مائل تھیں۔ قدیم علماء شائقین علم کو اپنے مکانوں پر مفت دیتے تھے۔ ان کے گھر تشنگان علم کے لئے سرچشمہ بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا بول بالا تھا۔ ایک طرف حضرت فیض کے شاگرد اپنے استاد کی میراث تقسیم کررہے تھے تو دوسری طرف داغ کی محفل آراستہ تھی۔ سرشار، ترکی، گرامی، ظہیر، حبیب کنتوری وغیرہ شمالی ہند سے آکر حیدرآباد کی فضاء کو شعر و سخن سے گرمارہے تھے مگر شاعری کا رنگ وہی قدیم تھا۔ گل و بلبل، شاہد و ساقی کی داستان شعراء کا موضوع بنا ہوا تھا۔ داغ نے غزل کے

مضامین

رنگ کو بدل دیا تھا۔

معاشرت میں اگرچہ مغربی طرز کی آمیزش ہوچکی تھی مگر مشرقیت کو غلبہ تھا' عام طور سے متوسط بلکہ اعلیٰ طبقہ کی اکثریت کا رجحان مشرقی نہج پر تھا۔ رہنے سہنے' پہننے اوڑھنے' کھانے پینے میں مشرقی تہذیب' مشرقی معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ مذہب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ مشائخ عظام نے اپنے سلسلوں کے مطابق پیری مریدی کی بساط بچھا رکھی تھی۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں امجد صاحب نے پرورش پائی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب کہ حیدرآبادی تہذیب مغربی تہذیب سے بدلنے لگی۔ رسم و رواج کھانے پینے رہنے سہنے میں مغربی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس ماحول کے مدنظر امجد صاحب کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب ماحول سے متاثر ہوئے ہیں۔

امجد صاحب کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین امور بہ الامتیاز نظر آتے ہیں۔ اولاً تنگدستی اور غربت۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ آپ کی پرورش کی کفیل بیوہ ماں تھیں۔ کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ پھر مدرسۂ نظامیہ میں غریب طالب علموں کی طرح آپ کی زندگی بسر ہوئی اور جب مستقل ملازمت ملی تو بیس روپے کی۔ اگرچہ اس زمانے کے بیس روپے آج کل کے سو روپے سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے مگر کھانے والوں کی تعداد کے لحاظ سے کبھی راحت حاصل نہ ہوئی۔ ایک زمانہ وہ بھی گذرا کہ صرف چنے کھا کر آپ نے بسر کیا اور کبھی یہ بھی ہوا کہ گھر میں جو سالن پکتا وہ مہمان یا خوشدامن اور سالے سالی کے آگے رکھ دیا جاتا اور امجد اور ان کی بی بی بغیر سالن کے کھاتے۔ اگرچہ وظیفہ کے کچھ عرصہ پہلے جب منتظم اور مددگار بن گئے تھے ماہوار تنخواہ ڈھائی تین سو روپے تھی مگر جو زمانہ تنگ دستی میں بسر ہوا تھا اس کی یاد فراموش نہیں کی ہوسکتی تھی۔

دوسری چیز غم والم' یاس وحسرت ہے۔ طغیانی رود موسیٰ میں گھر بار کے ساتھ مشفق ماں' بی بی اور لڑکی موجوں کی نذر ہوگئیں' سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔۔۔ پھر ایک عرصہ کے بعد قابل اور لائق بی بی جمال النساء کا ساتھ ہوا اور چند سال کے بعد ان کی موت نے پھر غم والم تازہ کردیا۔ دختر عظیم النساء کے انتقال کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس طرح امجد کی زندگی رنج والم اور یاس وحرماں کا ایک مجسمہ بن گئی۔

امجد کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی تیسری شئے تصوف ہے۔ موسیٰ ندی کی طغیانی کے بعد آپ درگاہ شاہ خاموشؒ صاحب کے سجادہ کے گھر مقیم رہے۔ موجودہ سجادہ سید شاہ صابر حسینی کی تعلیم وتربیت آپ سے متعلق رہی۔ اس حیثیت سے آپ کو تصوف سے مناسبت پیدا ہوگئی اور پھر شریکِ حیات جمال النساء (جمال سلمیٰ) کی بدولت تصوف سے رات دن کام رہا اور ان کی موت کے بعد آپ کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔

رباعیات کے شہنشاہ کی شاعری پر غور کیا جائے تو یہی تینوں آپ کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کے سوا سب سے بڑا عنصر انسانیت کی آواز ہے جو امجد کے کلام میں صحیح طور پر سنائی دیتی ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبدالحق نے مولانا حالی کے حالات کو حسب ذیل الفاظ پر ختم کیا ہے:

''مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت' ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کررہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے' ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ جب ملتے تو اس سے شفقت سے پیش آتے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں' کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی''۔ (چند ہم عصر ص:163)

بلا خوف تردید ہم ان سطور کو امجدؔ صاحب کی زندگی کے بارے میں بھی دہرا سکتے ہیں جو حرف بہ حرف صادق آتی ہیں۔ فقط

نصیرالدین ہاشمی

نقوش' لاہور (شخصیات نمبر جلد اول)

مضامین

مضامین

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی تحریروں میں سائنسی اثرات

محمد خلیل سائنسداں

ہم سب نے بچپن میں اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو کی چھ کتابیں ضرور پڑھی ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اپنی شروع کی تعلیم ان ہی کتابوں کو پڑھ کر کی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان میں ادب، تمیز اور تہذیب کو سکھانے والی ان کتابوں سے اچھی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ایک عرصہ سے ان کتابوں کو کیوں نہیں پڑھایا جارہا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارے بچے اس کے فائدے سے دور ہوگئے ہیں۔ لیکن تعلیمی ماہرین آج بھی اُردو زبان کی ان ابتدائی کتابوں کو پڑھنا ضروری قرار دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے واقف ہوسکیں۔ اسمٰعیل میرٹھی 1844 میں میرٹھ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا آبائی مکان تھا۔ وہ اب اسمٰعیل نگر کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے بزرگ بادشاہ اکبر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ان کا خاندان علمی ہونے سے مشہور ہوا۔ جنگِ آزادی جب شروع ہوئی تو وہ اپنے ایک پڑوسی کے یہاں اَفطار میں تھے، شور سنائی دے رہا تھا، یہ آزادی کی جنگ کی شروعات تھی۔

اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے ایک اندازے کے مطابق پچاس سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں رُجحان، زندگی کے مشاہدے اور احساس کو مرکز بنایا ہے جس کی وجہ سے انہیں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ ان کے کلام میں سائنسی اثرات نمایاں طور پر براہ راست شکل میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ نظموں کے موضوع بھی سائنسی ہیں۔ مثلاً صبح کو پرندوں کی آواز، چراگاہوں میں چرتے ہوئے مویشی۔ ان کے کلام میں اُس دور کی بیداری کا ذکر ہے، ان کے مشاہدے میں ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ کاشتکار کی محنت پر سارا دارومدار ہے۔ ان کی نظم ''کاشتکاری'' میں کسان کی زندگی کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے کسان کا ڑاعتی طریقہ بیان کیا ہے۔ اس کی پیداوار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ کسان کے ساتھ بَیل کا ذکر جڑا ہوا ہے۔ وہ رات میں جہاں چاہے آرام کرلیتا ہے، تکان کو دور کرنے کے لئے کسی بھی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور صبر وخوشی سے زندگی گزارتا ہے۔ یہ ساری باتیں انسان کو سبق دیتی ہیں۔ کاشتکاری کی اہمیت کو بتانے کے لئے ان کا یہ ایک شعر ہی کافی ہے:

گنج زر خاک سے اُگلوایا
کیمیا شغل کاشتکاری ہے

انسان میں عمل کا جذبہ پیدا کرنے کی اور مطمئن کرنے کی اس سے عمدہ دلیل کیا ہوسکتی ہے۔ ان کی نظم ''ہماری گائے'' پڑھ کر یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے گائے کی پرورش، دودھ، غذا کا تذکرہ اس طور پر کیا ہے کہ جیسے وہ عرصہ سے جائزہ لے رہے تھے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اسمٰعیل میرٹھی کا ذہن تعلیم وفن کے علاوہ سائنس کی ایجادوں سے بھی متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں جدید سائنس کے نقطہ نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم ''ریل گاڑی'' کو دیکھئے۔ یہ نظم بچوں کے لئے کہی گئی ہے۔ لیکن موضوع کی سائنسی اہمیت کی وجہ سے یہ عوامی معاشرے میں شمار کی جاتی ہے۔ اگر اس نظم کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اسمٰعیل میرٹھی نے اس نظم میں ریل کی شکل میں پورے ملک میں فیضان، سماج میں اس کی سہولتیں جو تجارت اور صنعت کو بڑھاتی ہیں، بیان کی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ملک کو اس سے فیض پہنچ رہا ہے، اس طرح انسانوں کے میل جول اور دنیا کی شادابی کو ایک نشانی۔۔ ریل سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ اس طرح ریل کو دوسرے شاعروں نے بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری میں سورج کا چُھپنا، پرندوں اور چرندوں کا اپنے آشیانوں میں پہنچنا، بارش کا پہلا قطرہ، ہوا اور سورج کا مقابلہ، قوسِ قزح، شفق،

رات، گرمی کا موسم، برسات، ہوا چلی، کوہ ہمالہ، کیڑا، اسلم کی بلّی، ہمارا کُتّا، کچھوا اور خرگوش، دو مکھیاں، اونٹ، شیر، مور اور کُلنگ، عجیب چڑیا، کوّا، ایک پودا اور گھاس، صبح کی آمد، چڑیا کے بچے، جاڑا اور گرمی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اُن کی نظر سے معمولی چیزیں بھی نہیں چھوٹتیں۔ وہ اُن میں قدر والی چیزوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ذرا سائنسی منظر کی عکاسی دیکھیں، اُن کی نظموں میں جس میں غیر براہ راست طور پر سائنس کا بیان ہے: ؎

اب ہوا کے تیز جھونکے رُک گئے
سوگئے پیڑ اور پتے جُھک گئے

اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم ''چھوٹی چیونٹی'' میں بچوں اور دوسروں کے لئے سبق کی نشاندھی ہے: ؎

کبھی تو نے ادھورا نہ چھوڑا
کبھی تو نے تکلیف سے منہ نہ موڑا

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی تیسری کتاب میں ''انسان اور جدید علوم'' کو اہمیت دی ہے۔ اس لئے کتاب کا مواد زیادہ انسانی اقدار اور سائنسی نقطہ نظر کا مظہر ہے۔

انہوں نے پن چکّی کو اُردو ادب میں ایک اہم مقام دیا۔ اس کے ذریعے مخلوق کی خدمت کے ساتھ بچوں اور بڑوں میں فرض کی دُھن اور زندگی کو کارآمد بنانے کی ترغیب دی گئی ہے: ؎

نہر پر چل رہی ہے پَن چکّی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

اُن کی نظم ''اندھیری رات'' میں جگنو کا چمکنا، ایک بچے کا اُسے ٹوپی میں چُھپانا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جگنو کی گفتگو کا بیان ہے:

جگنو:

چمک میری دن میں نہ پاؤگے تم
اُجالے میں وہ تو ہوجائے گی گُم

بچہ:

کروں گا نہ آزاد اُس وقت تک
کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

یہ موضوع بچوں کے لئے جانکاری کا بھی ہے اور حیرت پیدا کرنے والا بھی۔ یہاں جگنو کے چمکنے کا سائنسی نقطہ بچے کو مشاہدے کی طرف لے جائے گا۔

اسمٰعیل میرٹھی نئی تہذیب سے بیزار نہ تھے، وہ جدید علوم کے قدردان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں سائنسی اثرات نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے جغرافیہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جو اسکولی کورس (نصاب) میں داخل تھی۔

اسمٰعیل میرٹھی صرف بچوں کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی دوسری نظمیں بڑوں کے لئے بھی ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

☆☆☆

محمد خلیل
سائنسداں و سابق مدیر سائنس کی دنیا، نئی دہلی
H-51 اقبال لین، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم ''کورانہ انگریز پرستی سے چند اشعار

رہا وہ جرگہ جسے چرگئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار
وہ آنکھ میچ کے بر خود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش تو پس دریدہ کوٹ
سواریوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

ڈاکٹر آمنہ تحسین

ادب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فروغ : خواتین کے افسانوں کے حوالے سے ایک مطالعہ

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی سرسبز وشاداب سرزمیں پر وقفہ وقفہ سے انسانی قافلے آتے رہے اور فاتح یا مفتوح کی حیثیت سے بودوباش اختیار کرتے رہے۔ مختلف طبقات میں بٹے ہونے اور ان میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی اختلافات ہونے کے باوجود سب اپنی اپنی انفرادی شناخت اور باہمی میل ملاپ کے ساتھ صدیوں سے پرامن زندگی گذارتے رہے۔ آپسی میل جول میں ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا اور ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ جس کے نتیجہ میں جہاں سماجی سطح پر تمام ہندوستانیوں کی طرزِ معاشرت میں ایک رنگی پیدا ہوتی گئی وہیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ، خوشی وغم، عیدوتہوار، رسوم ورواج میں مشترک خصوصیات پیدا ہوتی گئیں۔ عرصہ دراز میں تشکیل پائی یہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی دراصل ہندوستانی سرزمین کی روح بن گئی۔ گویا اس سرزمین پر مذہبی ولسانی بے تعصبی، انسانیت نوازی، پیار محبت، اخوت، بھائی چارگی اور حب الوطنی کے مختلف پھول آئے دن کھلتے رہے۔ جس سے ہندوستان کا آنگن مہکتا رہا۔

صدیوں کے اس عظیم تاریخی وتہذیبی سفر کے دوران کہیں نہ کہیں کچھ ایسے متعصب ذہنیت والے بھی رہے جنھوں نے اپنی مفاد پرستی کے لیے اس مہکتے آنگن میں مذہب، ذات پات، زبان وتہذیب کے نام پر ایسا زہر پھیلایا جو ملک میں صدیوں سے قائم یکجہتی کی جڑوں تک جا پہنچا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو کہیں کھوکھلا کر گیا۔ مشترکہ تہذیب کے کھلے پھول کہیں مرجھانے لگے، کہیں مذہب، قوم، زبان، تہذیب کی شکل میں نفرت ونفاق کی سیاست پر پھیلانے لگی۔ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ جس میں انسانیت اور بھائی چارگی کا خاتمہ ہوتا گیا اور ہندستان کی روح زخمی ہوگئی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں بشمول اردو میں تحریر ہوئے ادب میں ہندوستانی سماج کی تصویر کے یہ دونوں رخ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان کا جنم جب ہندوستان میں ہوا تو وہ اسی خوبصورت مشترکہ تہذیب کی گود میں پل کر جوان ہوئی جس کی آبیاری صدیوں سے ہوتی چلی آئی تھی، مذہبی ولسانی تعصب کے بغیر تمام ہندوستانیوں نے اسے گلے سے لگایا اور پروان چڑھایا۔ چونکہ اردو ایک طرف عوام کے دلوں سے قریب تر زبان تھی تو دوسری طرف قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کی مظہر زبان سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بنا کسی مذہبی تخصیص کے سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کے لیے اس زبان کو اپنایا۔ گویا اردو زبان شاہ سے گدا تک، صوفی سے سنت تک، خواص سے عوام تک سب کی پسندیدہ زبان بن گئی۔ صدیوں کے اس تاریخی پس منظر میں جب ہم اردو زبان وادب کے سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ تمام سماجی وتہذیبی عناصر جو ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مشترکہ تہذیب'' کی روح ہوتے ہیں ان کے بڑے گہرے نقوش اس سرمایہ ادب میں نظر آتے ہیں جو دراصل مرد وخواتین قلم کاروں کی برسوں کی کاوشوں کا نتیجہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواتین کی تحریروں میں سماجی زندگی کے منفرد عکس کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی زندگی کی نایاب تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان خصوصیات کی بنیاد پر نسائی ادب کو ملک کا اہم تہذیبی ورثہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کے نسائی ادب کے جائزے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خواتین کے قلم سے نکلی تحریروں میں ہندوستانی سماج کی حقیقی تصویروں کو واضح انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خواتین نے مختلف اصنافِ سخن میں جہاں ہندوستانی طرزِ معاشرت، رسوم ورواج، انسان دوستی، پیار محبت، اخوت کے موضوعات کو تحریر کیا وہیں بیشتر قلم کار خواتین نے بالخصوص ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر اس سے جڑے کئی ایک موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصّہ بنایا اور نثر ونظم کے ذریعے نہ صرف اسے فروغ دینے کی کوشش کی بلکہ صدیوں سے چلی آرہی قومی یکجہتی کے ٹوٹنے بکھرنے کی تصویریں بھی پیش کیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی پامالی کے پسِ پردہ عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی اپنے فن پاروں میں بڑے موثر طریقے سے پیش کیا۔ پیش نظر مقالہ میں خواتین کے افسانوں کے حوالے سے فرقہ وارانہ ہم

مضامین

آہنگی اور قومی یکجہتی کے تصورات ونظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ادب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حوالے سے ابتدائی دور کی خواتین افسانہ نگاروں سے لے کر عصرِ حاضر کی قلم کار خواتین کی تحریروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اگر چہ کہ اس موضوع پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا گیا لیکن افسانہ نگاری کے اولین دور میں اس موضوع پر ایسے کوئی قابلِ ذکر افسانے نہیں ملتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک کی آزادی سے قبل ''فرقہ واریت یا فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' جیسے تصورات یا الفاظ یا اصلاحیں ہندوستانی سماج کا حصہ نہیں تھیں اور نہ انھیں تحریروں کا خاص طور پر موضوع بنایا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں مشترکہ تہذیب، آپسی رواداری اور بھائی چارگی کی سینکڑوں تصویریں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ تاہم ملک کی آزادی اور تقسیمِ ہند کے پس منظر میں متعصب انگریز قوم نے جس طرح سے فرقہ واریت کا زہر گھولا اور ہندوستانیوں کے ذہن کو آلودہ کرنے کی برسوں کوشش کی۔ ان کوششوں کے کہیں نہ کہیں اثرات مرتب ہوتے رہے جس کا سلسلہ آج بھی ہمیں نظر آجاتا ہے۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ سماج کی ذہن سازی کے لیئے ہر دور میں ایسا تعمیری ادب بھی لکھا جاتا رہا جو مختلف زاویوں سے سماج کا رہبر ورہنما بنا رہا اور ہندوستانی سماج کی شیرازہ بندی میں اپنا موثر کردار ادا کرتا رہا۔ ادب کی اس اہم حصّہ داری میں خواتین کے افسانوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ خواتین نے اپنے افسانوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے اہم تصورات کو عام کرنے کی بے حد اچھی سعی کی۔ بیشتر خواتین نے اس موضوع کو ضبطِ تحریر میں لایا ہے۔ تاہم یہاں خواتین کے چند ایک نمائندہ افسانوں کے حوالوں سے ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

عصمت چغتائی خاتون افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ عصمت کے پاس موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ خاص کر سماجی ظلم وجبر کے خلاف طنز واحتجاج اور انسان دوستی کے فروغ میں ان کا قلم بڑی تیزی سے چلتا ہے۔ انھوں نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہند اور فسادات کے تناظر میں کئی ایسے افسانے تخلیق کیے جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ٹوٹنے بکھرنے کی تصویروں کے ساتھ ساتھ اسباب بھی عیاں ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کا افسانہ ''جڑیں'' ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے اس دور کے ہندوستانی معاشرہ کا جائزہ لیا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں مختلف مذاہب کے ہونے کے باوجود ایک قوم کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کررہے تھے۔ دونوں قوموں کے اجداد کی جڑیں صدیوں سے اس سرزمین میں پیوست تھیں۔ لیکن تقسیمِ ملک کے موقع پر اختلافات کی ایک اونچی دیوار دونوں قوموں کے درمیان حائل ہوگئی۔ اس افسانے کے دو اہم کردار ''پنڈت جی'' اور ''اماں جی'' ہیں جن کے خاندان ملک کی تقسیم سے قبل شیر وشکر کی طرح رہا کرتے تھے ان میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا لیکن تقسیمِ ملک کے وقت در آئی سیاست نے ان کے خاندانوں میں نفرت کا زہر گھول دیا۔ جس کے اثرات یوں مرتب ہوئے کہ دونوں خاندان اچانک ایک دوسرے کے لیے بیگانے ہوگئے۔ ان کے گھر کے افراد میں ذہنی وفکری اختلافات پیدا ہوگئے اور دونوں گھرانوں کا آپسی بھائی چارہ یکسر ختم ہوکر رہ گیا اور خوف وہراس کا ماحول دونوں گھرانوں پر چھا گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ دونوں گھرانوں میں خلیج بڑھتی چلی گئی۔ عصمت چغتائی نے اپنے اس افسانے کے ذریعے اس وقت کے سیاسی کھیل اور اس سے متاثر ہوتے عام ہندوستانی افراد کے جذبات واحساسات کو بڑے ہی موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے چلی آرہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری و بھائی چارے کے بدلتے ماحول کو ایک حبِ وطن کس طرح سے محسوس کررہا تھا اور اس درد وکرب کو کیسے برداشت کررہا تھا اس پورے ماحول کی عکاسی عصمت چغتائی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں اماں کی ذہنی وجذباتی الجھن کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں وہ 15/اگست سے جب سے ڈاکٹر صاحب کے گھر ''ترنگا'' اور اپنے گھر پر ''لیگ کا جھنڈا'' لگا تھا۔ اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی خلیج حائل ہوگئی تھی جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنے غمگین آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر لرزا کرتیں۔''

ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہوا تو ''اماں'' کے منع کرنے کے باوجود ان

مضامین

کے تمام افرادِ خاندان ''پاکستان'' ہجرت کر گئے۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود ''اماں'' ہندوستان چھوڑ کر نہیں گئیں۔ وہ ایک سچّی ''محبّ وطن'' تھیں۔ انھیں اپنی زمین سے بہت پیار تھا۔ لہذا وہ ملک چھوڑ کر نہ جاسکیں اور گھر پر اکیلی ہی بچ رہ گئیں۔ جب ان کے پڑوسی ''پنڈت جی'' کو پتہ چلتا ہے کہ ''اماں'' پاکستان نہیں گئیں بلکہ انھوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی تو وہ متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دل سے ساری نفرت یکسر مٹ جاتی ہے اور وہی آپسی محبت اور ہم آہنگی و یکجہتی جو ان سب کی میراث تھی دوبارہ لوٹ آتی ہے۔ پھر اس رات ''اماں'' کے لیے کھانا ''پنڈت جی'' کے گھر سے بن کر آتا ہے۔ اس طرح سے عصمت چغتائی نے اپنے افسانے کے ذریعہ یہ اہم پیغام دیا کہ سیاسی ہتکنڈوں اور تقسیم کے المیہ سے وقتی طور پر ہندوستانی افراد متاثر ضرور ہوئے تھے لیکن فرقہ واریت کا وہ اثر زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ آپسی محبت، اخوت اور بھائی چارگی کی جڑیں دراصل ہندستانی سماج میں اس قدر گہرائی تک پیوست ہیں کہ وقت کی آندھی انھیں اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتی۔

رضیہ سجاد ظہیر نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ایک الگ زاویے سے اپنے افسانے ''نمک'' میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے کی کردار ''صفیہ'' ایک ایسی بے سہارا عورت کو اپنی ماں بنالیتی ہے جو غیر مسلم ہے اور تقسیمِ ملک کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئی ہے۔ صفیہ اس عورت سے بے انتہا محبت کرنے لگتی ہے اور اسے اپنے ہی خاندان کا حصّہ سمجھنے لگتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد کسی موقع پر ''صفیہ'' کو پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا ہے تب ''صفیہ'' کی ماں اسے لاہور سے اپنے لیے نمک لانے کی فرمائش کرتی ہے اور ''صفیہ'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ لاہور سے نمک سرحد پار نہیں لے جایا جا سکتا لیکن اپنی ماں سے کیے گئے وعدہ کے مطابق کسٹم کی سخت پابندیوں کے باوجود وہ نمک لانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس موقع پر کسٹم آفیسر کے ساتھ صفیہ کا جو مکالمہ اور مباحثہ ہوتا ہے وہ ہندوستان میں صدیوں سے چلی آرہی ہم آہنگی کے ثقافتی ورثہ کی بھرپور تصویر پیش کرتا ہے۔ صفیہ کسٹم آفیسر کو اس نکتہ پر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے کہ اگرچہ کہ مذہب اور فرقہ کے نام پر ملک کی زمین تقسیم ہوئی ہے اور افراد ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں لیکن ہمارے جذبات و احساسات ایک ہی ہیں جس کی آبیاری ایک ہی سرزمین پر ہوئی۔ صفیہ کے خیالات سے کسٹم افسر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اسے خود اپنے بچھڑے ہم وطنوں کی محبت یاد آجاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ:

''محبتیں تو کسٹم سے اس طرح گذر جاتی ہیں کہ قانون بھی حیران رہ جاتا ہے''۔ کسٹم آفیسر صفیہ کو نہ صرف لاہوری نمک لے جانے کی اجازت دیتا ہے بلکہ آگے یہ بھی کہتا ہے کہ ''جامع مسجد کی سیڑھیوں کو میرا اسلام کہیے گا''

مذکورہ حوالہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کیفیات دراصل ان تمام افراد کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں جو مذہب، ذات پات یا فرقہ کی سیاست سے بالاتر ہوکر خود کو اس ملک کی ایک ہی قوم تصور کرتے تھے۔ اگرچہ کہ سیاسی طور پر دو سرحدوں میں تقسیم تو ہوگئے لیکن ان کے جذباتی رشتے اسی طرح ہم آہنگ تھے جیسے صدیوں سے رہے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے کئی دوسرے افسانوں میں بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے جڑے مختلف موضوعات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ ''واردات'' بھی ایک اہم افسانہ ہے۔

قرۃ العین حیدر قومی یکجہتی کی ٹوٹ پھوٹ کو صدیوں کی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ ہندوستانی معاشرے کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتی ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتی ہیں کہ ماضی میں وہ کونسے عوامل تھے جس کے نتیجہ میں صدیوں میں تشکیل پائی فرقہ وارانہ ہم آہنگی پامال ہوتی چلی گئی اور ہندوستانی سماج میں مشترکہ تہذیب کی کرچیاں یوں بکھر گئیں۔ ان ہی تصورات پر مبنی ان کا افسانہ ''جلاوطن'' ہے جس کا کینوس ہندو مسلم اختلافات اور تقسیم ہند کے بعد پیش آنے والے واقعات ہیں۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر قومی یکجہتی کے ٹوٹنے کے اسباب تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے مذکورہ افسانے کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان سے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی اچانک ہی پامال نہیں ہوئی اور نہ تقسیم ہند کا واقعہ اچانک وجود میں آیا بلکہ انھوں نے اس افسانے میں ہندوستانی معاشرہ کا تجزیہ کچھ اس

مضامین

طرح سے کیا ہے کہ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دراصل متعصب ذہن افراد کے ذریعے سے ہندوستانی سماج میں فرقہ واریت کا زہر عرصہ سے سرائیت کیا جارہا تھا اور باہمی اتحاد کی بنیادیں کھوکلی کی جارہی تھیں۔تاکہ یہ ایک قوم بن کر نہ رہے اور مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر کمزور پڑ جائے۔ ہندواور مسلمان قومیں بظاہر ایک نظر آرہی تھیں لیکن اندر کہیں ایک دوسرے کے لیے نفرت کا زہر بھی پھیل رہا تھا اور آپسی تفرقے بڑھ رہے تھے جیسا کہ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔

''جنم جنم کے پڑوسی تھے۔اور کیا دوستی یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لیے ''ملیچھ'' ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔اور ہماری اماں کا یہ مسئلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا،ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟''۔

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں دونوں قوموں کے ذہنی ونظریاتی اختلافات کی بڑی اچھی عکاسی کی اور بتایا کہ برسوں میں معاشرتی سطح پر پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے آپسی مسائل آگے چل کر کس طرح سے بھائی چارگی کے خاتمہ کا باعث بنے اور بیرونی افراد کی ایماء پر ایک بڑے انقلاب کے پیش خیمہ بن گئے۔ پھر ملک تقسیم تو ہوا لیکن ساتھ میں فرقہ وارانہ فسادات کا بھی لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ وہی صدیوں سے مشترکہ تہذیب کی آبیاری کرنے والے اور ایک قوم کا تصور رکھنے والے اچانک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔انسانیت شرمسار ہوگئی۔

جیلانی بانو' افسانہ نگار خواتین میں ایک نمایاں اور اہم نام ہے۔انھوں نے ہندوستانی معاشرے کے بدلتے حالات اور آپسی قدروں کو ٹوٹتے بکھرتے بڑے قریب سے دیکھا ہے اور اس کے کرب کو محسوس کیا ہے۔وہ اپنے افسانوں کا مواد اسی عہد کی تہذیبی، سیاسی، سماجی فضاء سے اخذ کرتی ہیں۔فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی ان کے افسانوں کے موضوعات میں ایک اہم موضوع ہے۔اس موضوع پر ان کا قلم تیز دھار آلہ کی طرح کام کرتا نظر آتا ہے۔ جیلانی بانو فرقہ واریت پھیلانے والے عناصر بالخصوص سیاست دانوں اور سرکاری کارندوں پر خوب وار کرتی ہیں۔اس طرح کے موضوعات پر ان کے افسانے درشن کب دو گے، بھاگو بھاگو، دشتِ کربلا سے دور اور سچ کے سوا، نہایت اہم افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

افسانہ ''دشتِ کربلا سے دور'' زیرِ بحث موضوع پر ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ افسانہ آج کے سیاسی اور سماجی تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ شہر میں ''قومی یکجہتی'' کے موضوع پر سمینار منعقد کیا جارہا ہے جس میں ملک بھر کے دانشور اور سماجی، سیاسی شخصیتیں حصّہ لے رہی ہیں۔شرکاء میں ایک نوجوان ڈاکٹر اکبر بھی ہے جو جوہایت جوشیلا اور باشعور انسان ہے۔ڈاکٹر اکبر ہندوستانی سماج سے فرقہ واریت کے زہر کو دور کرنے اور مذہبی تعصب پسندی کو ختم کرنے کے لیے نہایت سنجیدہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اکبر سیمینار میں حصّہ لیتے ہوئے اپنی پر جوش تقریر میں مذہبی رہنماؤں اور سماج کے دانشور طبقہ کی بے ضمیری پر طنز کرتا ہے اور انھیں سماج سے فرقہ واریت کے نظریات کو ختم کرنے کے لیے عملی طور پر متحرک ہونے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اِدھر سمینار جاری رہتا ہے اُدھر شہر میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوجاتا ہے جس کی آگ سمینار ہال کے باہر تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے میں اکبر کہتا ہے کہ:

''خواتین وحضرات آج ہم سب قومی یکجہتی کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے اکھٹا ہوئے تھے لیکن ہال کے باہر اسی مقصد کو ختم کرنے والے آگئے ہیں۔میرا خیال ہے ہم سب کو بھی اس ہال کے باہر نکل کر اس آگ کو بجھانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر اکبر کی یہ تجویز تمام شرکاء کو سخت ناگوار لگتی ہے کہ فساد پھوٹ پڑا ہے اس لئے یہ وقت مناسب نہیں ہے ہال سے باہر جانے کے لیے۔ چنانچہ تمام شرکاء مل کر یہ طے کرتے ہیں کہ جب شہر میں فسادات رک جائیں گے تب ایک جلوس نکالا جائے گا جس میں ہندواور مسلمان حصّہ لیں گے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے متعلق سماج کو بتائیں گے۔ یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ اس ضمن میں ایک اور سیمینار یا کانفرنس بھی منعقد کی جائے گی۔لیکن اکبر کو یہ تجویز بالکل بھی پسند نہیں آتی ہے۔اس لئے کہ وہ خود کو ایک ذمہ دار شہری تصور کرتا تھا اور اپنے پیشے کے لیئے سچا تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی

مضامین

اندازہ تھا کہ شہر میں فساد کے نتیجے میں کتنے معصوم لوگ اپنی جانیں گنوا دیتے ہیں اور سینکڑوں گھائل ہو جاتے ہیں، انہیں اس وقت طبّی مدد کی ضرورت ہو تی ہے۔ چنانچہ وہ ریلیف ورک انجام دینے کے مقصد سے سیمینار ہال سے باہر نکل پڑتا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اطلاع آتی ہے کہ سیمینار ہال کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر اکبر کو فسادیوں نے ختم کر دیا ہے۔ وہ فسادی دراصل کسی ڈاکٹر اظہر علی کو مارنا چاہتے تھے جس کے لیے انھیں کسی سیاسی پارٹی نے بھاری رقم دی تھی۔ تاہم غلط فہمی کی بنا پر ڈاکٹر اکبر کا قتل ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر سیمینار کے تمام شرکاء دم سادھ لیتے ہیں۔ سیمینار ہال میں کچھ وقفے کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ بڑی دیر بعد شرکائے سیمینار کو خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر دھیرے سے سیمینار میں یہ تجویز رکھی جاتی ہے کہ:

''ڈاکٹر اکبر علی کی اچانک موت پر ہماری یہ سبھا اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتی ہے، اب ہم اپنے ساتھی کے قتل پر دو منٹ کی خاموشی منائیں گے اور بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ ان کی آتما کو شانتی دے۔''

لیکن شرکاء میں ایک مسز مہتا بھی تھیں جنھیں ڈاکٹر اکبر کے قتل سے بڑا صدمہ پہنچتا ہے اور انھیں سیمینار میں پیش کی گئی یہ تجویز بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ شرکاء کی بے ضمیری کا انھیں شدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ بے اختیار چیخ اٹھتی ہیں:

''نہیں۔ اب ہم سر جھکا کر خاموش نہیں کھڑے ہوں گے۔ نہیں! سر نہیں جھکانا ہے۔ ہمیں سر اٹھا کر اکبر کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے باہر نکلنا ہے۔''

اس طرح سے جیلانی بانو نے اپنے افسانے میں کئی ایک حساس واقعات کی قلمبندی کے ذریعہ جہاں ایک طرف قومی یکجہتی میں زہر پھیلانے اور فرقہ روایت کو فروغ دینے والے عناصر کی بڑی بے باکی سے نشاندہی کی ہے تو دوسری طرف سماج کے دانشور افراد کی بے ضمیری کو بھی خوب بے نقاب کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف مسز مہتا کے باضمیر کردار کے حوالے سے اس اہم تبدیلی کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اب ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی جنم لے رہا ہے جو فرقہ وارانہ عناصر کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہتا ہے نیز سماج سے تمام تفرقات مٹا کر ایک نئے سماج کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا سماج جس میں ایک دوسرے کے لیے حمیت و بھائی چارگی اور قومی یکجہتی پیدا ہو۔

عصرِ حاضر کی ایک اور خاتون افسانہ نگار قمر جمالی ہیں جن کے افسانے ''آخر کیوں'' اور ''روشنی'' میں آپسی رواداری، ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے تصورات بڑے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ افسانہ ''آخر کیوں'' میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بڑی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ہندوستان کی یہی مشترکہ تہذیب رہی جس میں ہندو اور مسلمان صدیوں سے دونوں مل کر ایک دوسرے کے عید اور تہوار ایک ساتھ منایا کرتے آئے ہیں۔ قمر جمالی نے اسی تہذیبی زندگی کی ایک خوب صورت تصویر اپنے افسانے میں پیش کی ہے۔ انھوں نے دیہات کی معاشرتی زندگی کے ذریعے بتایا کہ گاؤں کے مسلمان جب عید کی نماز کے لیے جاتے تو ہندو افراد کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہوتی اور جب دیوالی آتی تو گاؤں کے تمام مسلمان اپنے گھروں کو لال مٹی سے رنگتے اور دیپ بھی جلاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہاتوں میں یہ بھائی چارہ عرصہ دراز تک موجود رہا جب کہ شہر کی فضائیں تو بہت پہلے ہی فرقہ واریت سے زہر آلودہ ہو چکیں۔ جس کے اثرات نئی نسل تک جا پہنچے۔ اس کی ایک جھلک افسانے کی ان سطور میں دیکھی جا سکتی ہے۔ گاؤں میں بڑی اماں کو اپنے گھر کو لال مٹی سے رنگتے دیکھ کر شہر سے مہمان بن کر آئی ان کی پوتی سوال کرتی ہے: ''بڑی امّاں دیوالی کیا مسلمانوں کی عید ہے؟'' ''نہیں''! اماں جواب دیتی ہیں۔ آگے وہ اس طرح گویا ہوتی ہیں:

''عید صرف عید ہوتی ہے۔ یعنی خوشی منانے کا ایک بہانہ..... سکھ دکھ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا''۔

وہیں چند برسوں بعد جب بڑی اماں گاؤں سے شہر اپنے بچوں کے ہاں رہنے کے لیے آتی ہیں تو انہیں یہ دنیا گاؤں کی پیار محبت اور بھائی چارہ سے دور اجنبیت سے بھری ایک الگ ہی دنیا نظر آتی ہے۔ جہاں کوئی آپسی میل ملاپ، اتحاد و بھائی چارہ نظر نہیں آتا۔ قمر جمالی نے مذکورہ افسانے میں

مضامین

وقت کے ساتھ ساتھ شہروں اور دیہاتوں کی معاشرتی زندگیوں میں آئی تبدیلیوں اور افراد کے بدلتے ذہنوں کا فرقہ واریت کے تناظر میں بڑا ہی موثر تجزیہ پیش کیا ہے اور بتایا کہ اب شہروں میں آپسی محبت و بھائی چارہ کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ شہر کی فضائیں فرقہ واریت کے زہر سے آلودہ ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں عید اور دیوالی اب مذہبی تہوار بن گئے ہیں۔ جس میں صرف مخصوص مذہب کے افراد ہی حصّہ لینے لگے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں ان حالات کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ جیسا کہ بڑی امّاں کے شہر آنے کے کچھ وقفے بعد دیوالی کا تہوار آجاتا ہے لیکن اس تہوار کی خوشیوں کی کوئی جھلک انہیں اپنے گھر میں نظر نہیں آتی۔ وہ شدت سے خود کو تنہا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اس موقعہ پر سنائی دینے والی پٹاخوں کی آوازیں انھیں کسی بم کی آوازیں لگنے لگتی ہیں۔ جس سے وہ خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ قمر جمالی نے مذکورہ افسانے میں عصرِ حاضر کے سماجی حالات کو زیرِ بحث لایا ہے اور ہندوستانی سماج سے مٹتی ہوئی مشترکہ تہذیب کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی طرح افسانہ ''روشنی'' میں بھی قمر جمالی نے گاؤں اور شہر کے پس منظر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی اہمیت کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔

فریدہ زین کے افسانے ''چندا کی چاندنی، جائے پناہ، درد اور درماں، خون پھر خون ہے'' زیر بحث موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ اس ضمن میں فریدہ زین کے نظریات کو افسانہ ''خون پھر خون ہے'' کے اقتباس سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''کون سے مذہب نے آپ کو خون کا فرق دکھایا ہے' کن مقدس کتابوں نے خون کے الگ الگ رنگ دکھائے ہیں۔ خون تو خون ہے۔ چاہے وہ ہندو کا ہو یا مسلمان کا..... وعدوں کی آبرو رکھنے کے لیے یہ ماتھے کا تلک بن جاتا ہے اور وطن کی راہ میں سر کٹا کر جب بہتا ہے تو اسے شہید کا مرتبہ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب انسانیت سے اپنا ناطہ توڑ نہیں سکتا۔''

فریدہ زین نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سماج میں دھیرے دھیرے آنے والی اس تبدیلی کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں آج پڑھا لکھا نوجوان طبقہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی کوشش میں آگے آرہا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے افسانے ''خون پھر خون ہے'' میں ایک ایسے ہی کردار ''دیپک'' کو پیش کیا ہے۔ جو ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو کسی مذہب سے جوڑنے کی سخت مخالفت کرتا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما سیاست کا تجزیہ بھی بخوبی کرتا ہے۔ ''دیپک'' کی زبانی یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''آشا کے جلانے والے، اشرف کو مارنے والے، میرے گھر کو لوٹنے والے نہ مسلمان تھے نہ ہندو بلکہ یہ وہ درندے ہیں جن کا مذہب ظلم، جن کا ایمان فساد، جن کی پوجا قتل، جن کی عبادت لوٹ مار، جو چند سکوں کے عوض انسانیت کو بیچ دیتے ہیں۔''

الغرض پچھلے صفحات پر چند ایک افسانوں کے حوالے سے ایک مختصر تجزیہ پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں خواتین کے تحریر کردہ اور بھی افسانے بطورِ مثال لیے جاسکتے تھے لیکن ایک مضمون میں یہ ممکن نہیں۔ اسی لیے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا۔ مختلف افسانوں کے حوالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی اچھی کوشش کی۔ خواتین نے نہ صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی دیرینہ روایت کے ٹوٹنے کے درد کو اپنی تحریروں میں اتارا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ان اسباب کی تلاش کی بھی کوشش کی جس کے نتیجہ میں صدیوں سے چلی آرہی بھائی چارگی، رواداری اور ہم آہنگی کا خاتمہ ہوتا گیا۔ خواتین نے اپنے افسانوں میں مختلف اور اہم واقعات کی پیش کشی کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے نہایت پراثر پیغام بھی دیے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے عہد کے اس اہم مسئلہ کو ضبط تحریر میں لاکر سماج کے لیے غور و فکر کے دائرے کو وسیع کیا۔ اس موضوع پر مزید مطالعہ و تحقیق کئی ایک اہم حقائق کی نشاندہی کرسکتی ہے اور بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں خواتین کی اُردو خدمات کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرسکتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر آمنہ تحسین
شعبۂ تعلیمِ نسواں، مانو۔ حیدرآباد

مضامین

اُردو رسم الخط کی تدریس

ڈاکٹر محمد اکبر

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ان زبانوں میں زیادہ تر زبانیں ایسی ہیں جن کی حیثیت علاقائی ہے ۔جن کا دائرکار بہت حد تک سمٹا ہوا ہے۔مگر اردو ہندوستان کی ان چند زبانوں میں سے ایک خاص اور اہم زبان ہے جو اپنی کم سنی کے باوُجود بہت ترقی کی،تقسیم ہند سے پہلے ایک لمبے عرصے تک ہندوستان کی سرکاری زبان ہونے کا شرف بھی حاصل تھا،اور اسے رابطے کی زبان کی حیثیت بھی حاصل رہی ۔اور آج بھی ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں اسے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں ۔اردو صرف کشمیر سے کنیا کماری تک ہی نہیں بلکہ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔لسانی عصبیت کے اس دور میں بھی اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو اپنی سحر آفرینی اور کشش کے سبب عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔اگر پرنٹ میڈیا یا الکٹرانک میڈیا کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اردو زبان ذرائع ابلاغ و ترسیل کی پسندیدہ زبان ہے۔ہر جگہ اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں خواہ وتفریحی پروگرام ہوں یا سیریل،یا فلم وغیرہ۔

ہندوستان کی سبھی زبانوں میں اردو ہی صرف ایک ایسی زبان ہے جس کا حلقہ سب سے زیادہ کشادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو آج سب کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے اور عام بول چال میں رچی بسی ہوئی ہے۔اسی لیے وہ ضرورت کی زبان بنتی جارہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمارے لیے ایک مسئلہ بھی ہے کہ ایسے طلبا کو ہم اردو زبان اور رسم الخط کن طریقوں سے اچھی طرح سیکھا سکتے ہیں۔نصاب اور طریقے کار کو وقت اور تقاضے سے ہم آہنگ کیا جائے اور ان مسائل پر غور وخوض کیا جائے جو زبان کی تدریس میں درپیش ہیں،تاکہ اس سے طالب علم آسانی سے اردو رسم الخط سیکھ سکیں۔

رسم الخط طرز تحریر،لکھاوٹ ،لپی اور اسکرپٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔دنیا میں ہر زبان کا رسم الخط بھی ہو یہ ضروری نہیں۔بہت سی زبانیں صرف بولی جاتی ہیں لکھی نہیں جاتی اور بعض زبانوں کا رسم الخط معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مشترک ہیں اور تمام رسم الخط کے اپنے بنیادی حروف تہجی ہوا کرتے ہیں جن کی ترتیب سے لفظ بن جاتے ہیں الفاظ سے کلمہ بنتا ہے اور کلمات یا جملوں سے شعر ونثر وجود میں آتے ہیں۔

رسم الخط کی بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندی اور اردو یہ دونوں زبانیں ایک ہیں۔ایک حد تک یہ درست بھی ہے مگر ارتقائی اعتبار سے یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں دونوں زبانیں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دہلی کی گردونواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں بقول گوپی چند نارنگ ''اردو ہندی کو اب دو ملتی جلتی لیکن آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے۔'' بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان کی آوازوں کو علامتوں سے ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ زبان کا تابع ہوتا ہے وہی اس زبان کی شناخت بنتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی بھی رسم الخط میں دوسری زبانوں کی آوازوں کو بڑی حد تک آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔لیکن صرف ایک زبان کا رسم الخط اسی زبان کی صوتیات کو پوری طرح پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔چنانچہ اردو کا رسم الخط اردو کے لیے مخصوص ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط صدیوں کے تجربات اور استعمال کے بعد اس مقام تک پہنچا ہے کہ اس کی مانوسیت اور ہم آہنگی اردو زبان کی صوتیات سے بالکل گھل مل گیا ہے۔اسی لیے اب اس کی کھال نوچ کر اس پر دوسری کھال چڑھانا بہتر نہیں اس عمل سے اردو زبان کی شناخت اور انفرادیت ختم ہوسکتی ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کر دینا چاہیے کیوں کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا بنگالی اور آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا کیونکہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی جانشین ہیں ان کا رسم الخط ایک دوسرے

مضامین

سے مختلف ہے۔ ہندی اردو کا معاملہ بھی یہی ہے۔ دونوں زبانیں آریائی ہیں مگر ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ گئی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کی تجویز بہتر نہیں۔

یہ بھی زمانے کا ستم ہے کہ اردو رسم الخط کو عربی رفارسی کا رسم الخط بتا کر اسے خصوصاً ہندوستان میں باہری یا غیر ملکی رسم الخط بتایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اسے قرآن مجید کے رسم الخط سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں زبان نے اپنا رسم الخط تبدیل کر لیا ہے اور ترقی پذیر ہیں ہمیں یہ بات ماننے میں کوئی دقت نہیں۔ اگر کسی زبان کا رسم الخط انتہائی ناقص ہے یا رسم الخط کی تبدیلی سیکڑوں برسوں کی لسانی اور تہذیبی تحریکوں کے زیر اثر ہو جائے تو وہ تبدیلی نامناسب نہیں ہے۔ مگر اردو ایک مخلوط زبان ہے اس نے ہندوستان اور عرب و ایران سب سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کا رسم الخط بھی اشتراک اور ارتباط کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ اردو رسم الخط اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہے لیکن عربی سے براہ راست نہیں لیا گیا اردو کے لیے اسے ایک ایسے مرحلے پر اپنایا گیا جب یہ فارسی زبان کی ضرورتوں کے مطابق ترمیم اور اضافے سے ہم کنار ہو چکا تھا۔ اس نے زبانوں کے آریائی اور سامی خاندانوں کے اسی اشتراک پر اکتفا نہیں کیا جو ایران میں ظہور پذیر ہوا تھا بلکہ انڈیا میں تقریباً سبھی آریائی زبانوں کی آوازوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ حروف تہجی ''پ'' ''چ'' ''ژ'' اور ''گ'' کا اضافہ فارسی زبان میں ہو چکا تھا۔ مزید آوازوں کے لیے تین نئے حروف ٹ، ڈ، اور ''ڑ'' بڑھائے گئے ہائے مخلوط کی حیثیت سے دو چشمی (ھ) کا استعمال اتنا قدیم نہیں لیکن ایک عرصے سے یہ بھی اردو رسم الخط کا اہم جز ہے۔ اس طرح اردو رسم الخط نہ عربی ہے اور نہ فارسی بلکہ ایک آزادانہ حیثیت رکھتا ہے جب کہ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

''جس طرح اردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے اسی طرح رسم الخط بھی ایک آزاد اور مستقل رسم الخط ہے۔''

(اردو رسم الخط ۔تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی مارچ 1972 ص 128)

اردو کے حروف تہجی جامع اور ترقی یافتہ ہیں اس کا مقابلہ بہت کم زبانوں کے حروف تہجی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں:

''ان میں ہر آواز کے ادا کرنے کی گنجائش ہے اور اس خیال سے اردو ابجد کو دنیا کی بہت سی زبانوں پر ایک طرح کا تفوق حاصل ہے۔''

(قواعد اردو از مولوی عبدالحق ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص ۱۱)

اردو کے حروف تہجی میں اکثر لسانی آوازیں انسانی نطق سے نکلنے والی اس میں قید ہیں، اردو زبان ہمیں بولنے کا سلیقہ اور درست تلفظ کا صحیح طریقہ سکھاتی ہے۔ اردو دنیا کی ان چند تہہ دار زبانوں میں سے ہے جس میں متعدد منفرد ممتاز صوتیاتی نظام ایک وسیع تر لسانی پیکر میں ڈھل کر بیک وقت کام کرتے ہیں۔ چنانچہ زمانے قدیم میں جب اردو عربی فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی تو کئی علامتیں ایسی تھیں جن کے لیے آوازیں نہیں تھیں اور کئی آوازیں ایسی تھیں جن کے لیے علامتیں نہیں تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی علامتوں کا اضافہ ہوتا رہا اور تبدیلیوں کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور لکھنے والے اپنے اپنے طور پر لکھتے رہے۔

اگر ہم اردو حروف تہجی کی بات کریں تو دیکھتے ہیں کہ اردو میں حروف تہجی 36 ہیں اور اس کے علاوہ 16 وہ حروف ہیں جسے ہکاری آواز یا بھاری آواز بھی کہتے ہیں اس طرح سے کل حروف تہجی 52 ہو جاتی ہیں۔ جب کہ بعض لوگوں نے ہمزہ اور مد کو بھی حروف تہجی میں شامل کرتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے کیوں کہ یہ ایک علامت ہے جس طرح زبر زیر پیش ایک علامت ہے اسی طرح ہمزہ اور مد بھی ایک علامت ہے۔ انگریزی میں صرف 26 ہیں ہندی میں 42 عربی میں 29 فارسی میں 32 ہیں، اردو میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اس میں ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی تقریباً ہر زبان کا مجموعہ بن گئی ہے۔ اردو اپنے ذخیرہ الفاظ اور صرف و نحو کے اصول کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے اسی طرح اس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے۔

مضامین

بہت سی بنیادی باتیں جو عربی و فارسی میں ہیں وہ سب کی سب اردو میں داخل ہوئی ہیں اور جب تک ہم ان باتوں کو اپنے طالب علموں کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کراتے اس وقت تک نہ ہم اردو کو اچھی طرح سمجھ پائیں گے اور نہ ہی پڑھ پائیں گے اور نہ بول پائیں گے۔ مثال کے طور پر ہم ہمزہ کو دیکھتے ہیں تو ہمزہ عربی میں ایک مستقل آواز ہے اردو میں اس کی وہ صوتی حیثیت نہیں تاہم اردو میں ہمزہ عربی سے ماخوذ لفظوں کے علاوہ بہت سے دیسی لفظوں میں استعمال ہوتا ہے اردو میں املا کا تصور ہمزہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمزہ حرف یا شوشے کے اوپر ہی لکھا جاتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں چنانچہ اس کو ہمیں ماننا چاہیے۔

اردو میں ہمزہ کے استعمال کے بارے میں یہ آسان سا اصول نظر میں رکھنا چاہیے جس لفظ میں بھی دو مصوتے یعنی حرف علت یا حرکات (Vowel) ساتھ ساتھ آئیں اور اپنی اپنی آواز دیں (پوری یا جزوی) وہاں ہمزہ کو لکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کو+ئی، جا+ے، کھا+ؤ، نا+ئی وغیرہ۔

اگر کوئی لفظ کسی ترکیب کا حصہ ہوں تو انھیں جوں کا توں لکھنا چاہیے۔ ضیاءالرحمٰن، ذکاءاللہ ثناءالحق علاءالدین وغیرہ۔

آپ نے حروف تہجی میں ایک حرف پڑھا ہوگا ''ہ'' یہ تین طرح کی ہوتی ہے۔ ہائے ملفوظ، ہائے مختفی اور ہائے مخلوط۔

ہائے ملفوظ: وہ ''ہ'' جو پوری تلفظ میں آئے لفظ کے شروع میں بیچ میں اور آخیر میں ہر جگہ آتی ہے۔ جب یہ شروع میں آتی ہے تو شوشے دار لکھی جاتی ہے۔ اور پہچان کے لیے ایک اور شوشہ لگا دیتے ہیں۔ جیسے ہار، ہم، ہو، ہر وغیرہ، جب بیچ میں آتی ہے تو اسے کہنی دار لکھا جاتا ہے اور پہچان والا شوسہ یا (لٹکن) ضرور لگایا جاتا ہے مثال کے طور پر بہت، نہیں، بہتر، تہوار، کہنا وغیرہ آخر میں آئے تو جیسے چاہ، راہ، بادشاہ، پناہ، عیدگاہ آخیر میں پوری آواز دے رہی ہے۔

ہائے مختفی یا ہائے خفی: لفظ کے آخیر میں آتی ہے تو یہ چھپی ہوئی ہوتی ہے یہاں الف کی آواز دیتی ہے۔ اس کو ہم ہائے خفی کہتے ہیں مثلاً کافلہ، راستہ، مدرسہ، درجہ، مرتبہ، پیسہ، اشارہ وغیرہ ان باریکیوں کو طلبا کو سمجھانا ضروری ہے تاکہ وہ اچھی طرح لکھ پڑھ سکیں۔

تیسری ہائے مخلوط ہے اس کو دوچشمی ھ سے لکھتے ہیں اس کی آواز اپنے سے پہلے والے حروف سے مل کر نکلتی ہے جسے ہکاری آواز بھی کہتے ہیں۔ بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ اور گھ وغیرہ۔

اکثر اس میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ عربی کی نقل میں ہے کو دوچشمی ھ سے لکھ دیتے ہیں، اور اسی طرح ہندوستان کو بھی دوچشمی ھ سے لکھتے ہیں مثال کے طور پر دہلی، ہمیشہ کو بھی دوچشمی ھ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ایک استاذ کو اس فرق کو بتانا نہایت ضروری ہے تاکہ بچے کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس دوچشمی ھ کا استعمال کب اور کہاں کرنا چاہیے اور اس کی مشق بھی کرائی جائے۔

واؤ کے بارے میں تھوڑی جانکاری ضروری ہے۔

واؤ معروف: وہ واؤ جو اُو کی آواز دے اسے ہم معروف کہتے ہیں جیسے دور، دُھوَل، پھُوَل اور بھُوَل وغیرہ

واؤ مجہول: جو واؤ اُو کی آواز دے جیسے شُوْر، بُوْل، مُوْڑ، چُوْر وغیرہ

واؤ ماقبل مفتوح جو اَوْ کی آواز دے یعنی و سے پہلے زبر ہو جیسے طَوْر، دَوْر، غَوْر، دَوْڑ اور فَوْق وغیرہ

واؤ معدولہ: اس واؤ کو کہتے ہیں جو لکھی جاتی ہے مگر پڑھی نہیں جاتی ایک واؤ معدولہ الف کے ساتھ لکھتے ہیں اور ایک بغیر الف کے مثلاً الف کے ساتھ خواب، خواجہ، خواہش، خواہ، خوار وغیرہ۔

بغیر الف کے جو لکھتے ہیں مثلاً خود، خورشید، خوش وغیرہ۔

اسی طرح سے یائے معروف جو اِی کی آواز دے جیسے دین، بین، میر، تیر، میر وغیرہ۔

یائے مجہول جو اے کی آواز دے جیسے دِیر، میرا، تیرا، میل وغیرہ۔

یائے ماقبل مفتوح جو اَے کی آواز دے جیسے پَیر، تَیر، مَیل، سَیر وغیرہ۔

رسم الخط کی یہ چند بنیادی باتیں ہیں جن کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ نون گنہ، واؤ عطف اور اضافت بھی ہے جس کا

مضامین

اردو رسم الخط میں ایک اہم رول ہے اگر ہم اضافت کو لیں تو اس کے بہت سارے فائدے ہیں یعنی اضافت کے معنی ہی ہیں دو لفظوں کے درمیان رشتہ قائم کرنا۔ شاعری میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم اضافت کو صحیح سے نہیں سمجھتے ہیں تو اردو رسم الخط کو ہم ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتے ۔ یہ بھی فارسی اور عربی سے اردو میں آئی ہے۔ شاعری میں اس سے زور پیدا ہوتا ہے اور بہت سارے الفاظ لکھنے سے ہم بچ جاتے ہیں۔ ہندی میں یا آسان اردو میں اس رشتہ کو کا، کی، کے سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے ہمیں کہنا ہے 'غالب کا کلام' 'غالب کی یادگار' یا غالب کے خطوط اردو میں ایک طریقہ یہ ہے دوسرا طریقہ عربی اور فارسی والا ہے مثلاً اسی لفظ کو ہم یوں کہیں گے کلامِ غالب، یادگارِ غالب اور خطوطِ غالب یہاں ہم نے اضافت کے ذریعہ مرکب الفاظ بنایا ہے شاعری میں ہمیں اس کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

ابتدائی سطح پر اردو زبان سیکھنے کے مسائل اور نصاب کے سلسلے میں ان تمام باتوں کا خیال کیا جانا ضروری ہے تب جا کر کہیں ہم نئے سیکھنے والوں کے ذہنی معیار کو بلند کر سکیں گے۔ یوں تو ہر سیکھنے والوں کے لیے رسم الخط ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے مگر اردو رسم الخط کے جو مسائل ہیں ان کی نوعیت تھوڑی مختلف ہے۔ اردو کی اپنی ایک خاص آوازیں ہیں اور یہی آوازیں لفظ بن کر مخصوص تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں البتہ کچھ آوازیں ایسی ہیں جن میں فرق کرنا مشکل ہے جن کی کئی وجوہات ہیں۔ ایسے طالب علم عام طور پر ج ز کی آوازوں کو وہ جانتے ہیں مگر وہ اس کی ادائیگی نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی طرح Z کی آواز کے لیے ہمارے پاس کئی حروف ہیں (ذ، ز، ض، ظ) ان آوازوں کے فرق کو ہم اپنی تحریروں میں رکھتے ہیں مگر کیا بولنے میں بھی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ آپ اگر غور کریں تو دیکھیں گے کہ سوائے ج اور ز کے کوئی فرق نمایاں نہیں ہوگا بالکل اسی طرح جب ہم ع کو دیکھتے ہیں تو کیا ع کی آواز کو پوری طرح واضح کر پاتے ہیں اسی طرح ت اور ط میں کیا فرق کرتے ہیں نئے سیکھنے والوں کے لیے یہی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں جو چیزیں عمل میں نہیں ہوتی ہیں ان کا سیکھنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر جو چیزیں Practice میں ہوتی ہیں ان کا سیکھنا اور سکھانا دونوں آسان ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں سے یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ایک ہی آواز کے لیے اتنے حروف کی کیا ضرورت ہے۔ انھیں سمجھانا اور پورے طور پر مطمئن کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے جب تک ان کو اور ان آوازوں کے طریق ادائیگی اور مخارج کی باریکیوں سے آپ بخوبی واقف نہ کریں گے تو وہ مطمئن نہیں ہوں گے۔ اور یہ باریکیاں اردو زبان کی نزاکتیں بھی ہیں اور حسن بھی لہذا اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

یہ آوازیں جہاں سے ہم نے مستعار لیا ہے وہاں تو باقاعدہ فن تجوید موجود ہیں وہاں اس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے مگر ہمارے یہاں ہم اس کو ہندوستانی مزاج کے مطابق ڈھال کر تلفظ کرتے ہیں۔ اب اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ استاذ ان آوازوں کو خود ادا کریں اور طلبا اس کو دہرائیں پھر لفظوں کے ذریعہ ان آوازوں کو کیسے استعمال کیا جائے بلیک بورڈ کے ذریعہ سمجھایا جائے اور اب تک یہی طریقہ اپنایا جاتا رہا ہے۔

اگر ہم اس کے لیے جدید سمعی بصری امداد کا بھی استعمال کریں تو کم سے کم وقت میں بہت آسانی سے سکھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں Language lab اور Audio Vidio وغیرہ سے مدد لے سکتے ہیں اس طرح کی آوازوں پر مشتمل الفاظ کی زیادہ سے زیادہ مشق کرائی جائے تاکہ ان کے ہجے یاد ہو جائیں اور الفاظ کی شکلیں بچوں کے ذہن میں بیٹھ جائیں اگر بچوں نے اردو کی چند علامتوں کو سیکھ لیا تو اردو کے تمام حروف سیکھ لینا کوئی مشکل نہیں۔ آج اس ٹیکنالوجی کے دور میں ٹیکنالوجی کی مدد سے زبان سکھانا اور بھی آسان ہو گیا ہے۔

بحر حال ایک کامیاب استاذ بڑی خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ اس سے طلبہ کے تجسس کی تسکین ہوگی اور بہت آسانی سے زبان و ادب سے واقف ہو سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ بھی ہوگا۔

ڈاکٹر محمد اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر، سی پی ڈی یو ایم ٹی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

مضامین

خواجہ جہاں عمادالدین محمود گاواں کی علمی وادبی خدمات

ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی

سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے 1347ء میں دکن کی پہلی خود مختار مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تاریخ میں اسے بہمنی سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے جو بالآخر دو صدیوں تک قائم رہنے کے بعد پانچ ریاستوں میں منقسم ہوگئی۔ بیجاپور کی عادل شاہی، احمد نگر کی نظام شاہی، گولکنڈہ کی قطب شاہی، برار کی عماد شاہی اور بیدر کی برید شاہی۔ دکنی زبان کے ارتقا، فروغ اور سرپرستی کے لحاظ سے عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا نام زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے صرفِ نظر بہمنی دور کے بیدر میں ایک ایسا تاریخ ساز شخص گذرا ہے جو بادشاہ نہیں تھا لیکن اس کی علمی وادبی خدمات اتنی گراں قدر ہیں کہ معاصر دکنی بادشاہوں پر وہ بازی لے گیا۔ تھا وزیر مگر اس کے اندر شہنشاہوں، سپہ سالاروں، علماء، صوفیا اور تجار کی صفات بیک وقت موجود تھیں۔ ایسے جامع کمالات شخص کا نام ''خواجہ جہاں عمادالدین محمود گاواں'' ہے، جس کے بارے میں مولوی محمد عزیز مرزا سیرۃ المحمود میں رقمطراز ہیں:

''اس شخص (محمود گاواں) کی ذات بہت سی عمدہ صفات سے متصف تھی۔ مجلس شوریٰ میں بیدار مغز مشیر، میدان جنگ میں خوش تدبیر جنرل، علماء میں عالم باعمل، فقرا میں صوفی صاف نہاد اور دنیاداروں میں ایک کامیاب دنیادار تھا۔ یہ شخص نہ صرف دکن کی تاریخ میں فرد ہے بلکہ تاریخ اسلام میں بھی بہت کم ایسے شخص ملتے ہیں جن کی ذات اتنی اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہو۔''

سیرۃ المحمود، محمد عزیز مرزا (نظامی پریس بدایوں: 1937)، صفحہ:4

محمود گاواں کی پیدائش گیلان کے ایک گاؤں ''قاوان'' میں 1405ء کو ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گاواں نام سے مشہور ہوا۔ گواس کا خاندان حکومت کے وزرا میں شامل تھا مگر ریشہ دوانیوں کی وجہ سے محمود گاواں مکۃ المکرّمہ ہجرت کر گیا۔ خاندانی روایات کے برخلاف تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ سیاحت کے شوق نے ملکوں کی سیر کرائی۔ علوم سے محبت نے علما ومشائخ کی صحبت میں پہنچایا۔ خلیج فارس کو عبور کر کے زائد از چالیس سال کی عمر میں وہ ہندوستان پہنچا۔ یہاں بیدر کو اس نے اپنا مسکن بنالیا۔ اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت اپنے عروج پر تھی، جبکہ دہلی میں لودھیوں کی حکومت تھی۔

دکن میں جنگجو قوموں کی آمد اور سکونت پذیر ہونے کا سلسلہ علاء الدین خلجی کے دور سے شروع ہو چکا تھا۔ بالآخر امیران صدہ جیسے سیاسی انتظام کے قائم ہونے کے بعد اقتدار اور فوج کو یہی باہر سے آئی ہوئی قوموں نے سنبھال رکھا تھا۔ چند نسلوں کے بعد یہ دکنی کہلائے جانے لگے اور تازہ تازہ جو بیرونی قومیں آتی رہیں وہ ''آفاقی'' اور ''غریب الدیار'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ بہمنی سلاطین نے ان آفاقیوں کو اپنی ضرورت کے پیش نظر فوج اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مگر رفتہ رفتہ دکنیوں اور آفاقیوں کے درمیان رقابتیں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا سلسلہ چل پڑا۔ احمد شاہ اول کے زمانے میں مخالفت کے آثار ظاہر ہوئے، جو آگے چل کر بہمنی سلطنت کے زوال کا سبب بنا۔ احمد شاہ اول کے بعد علاء الدین ثانی کے عہد میں محمود گاواں کی دکن میں آمد ہوئی۔ یہ انتہائی پر آشوب دور تھا۔ 1456ء میں جب سلطان علاء الدین ثانی کے بہنوئی جلال خان نے تلنگانہ پر قبضہ کر کے مالوہ اور خاندیس

مضامین

کے حکمرانوں کو بھی دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو محمود گاواں کو ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی ذمہ داری ملی وہ تجارت کو ترک کر کے تلنگانہ کی جانب بڑھا اور جلال خان کے زیر نگیں قلعہ نلگنڈہ کا محاصرہ کر لیا چنانچہ ابھرتی ہوئی بغاوت کو کچل دیا۔ محمود گاواں کی اس دانشمندی، جرأت، اور وفاداری کی بنا پر اسے مصاحبین اور امراء میں شامل کرلیا گیا۔ یہی وہ تاریخی موڑ ہے جب محمود گاواں کا اقبال بلند ہونے لگا۔

علاء الدین شاہ ثانی کے بعد ہمایوں شاہ ظالم (تاریخ میں وہ ظالم کے لقب سے مشہور ہے) کے چار سالہ دور میں محمود گاواں تلنگانہ میں امن قائم کرنے میں مصروف رہا پھر 1461ء میں جب ہمایوں شاہ ظالم کا آٹھ سالہ بیٹا نظام شاہ تخت نشین ہوا تو حکومت کی اصل باگ ڈور نظام شاہ کی والدہ ملکہ مخدومہ جہاں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ملک التجار محمود گاواں کو اس نے اپنا مشیر خاص بنایا۔ دکن میں ایک بچے کی حکومت سمجھ کر گردونواح کی ریاستوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ مالوہ کے محمود شاہ خلجی کو محمود گاواں کے لشکر سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود دکن کی فوج شکست سے دوچار ہوگئی۔ محمود شاہ خلجی محمد آباد (بیدر) میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا مگر محمود گاواں نے ہمت نہ ہاری بلکہ سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے نظام شاہ کی جانب سے خط لکھ کر سلطان محمود شاہ والی گجرات سے مدد طلب کی۔ سلطان محمود شاہ بڑی سرعت کے ساتھ اسّی ہزار سوار لے کر دکن وارد ہوا۔ محمود خلجی کو اس کی خبر ہوئی تو گھبرا کر بیدر سے روانہ ہوگیا۔ جب حالات بہتر ہوگئے تو ملکہ مخدومہ جہاں نے اپنے لڑکے سلطان نظام شاہ کی شادی کے انتظامات بڑی دھوم دھام سے کئے مگر سوئے قسمت بزم شادی سجی تھی کہ دولہن کی ڈولی اُٹھنے کے بجائے نظام شاہ ثانی کا ڈولہ اٹھ کر قبرستان پہنچ گیا۔

نظام شاہ ثانی کے بعد اس کا چھوٹا بھائی محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ تقریباً دو دہوں تک اس نے حکومت کی۔ اسی کے زمانے میں محمود گاواں کا عروج ہوا۔ پھر آخر میں شہادت نصیب ہوئی۔ اس عہد میں محمود گاواں کی اب تک کی سب سے بڑی مہم کوکن اور گوا کی فتح ہے۔ تین سال کے بعد جب وہ بہمنی سلطنت کی توسیع کر کے محمد آباد، بیدر لوٹا تو وہاں جشن کا ماحول اس قدر تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ محمود گاواں کو انعامات والقابات سے نوازا گیا۔ ملکہ مخدومہ جہاں نے ''بھائی'' کے لقب سے مخاطب کیا۔ محمود گاواں جیسا مہم جو کہاں بیٹھنے والا تھا لہذا کوکن و گوا کے بعد بلگام اور وجے نگر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں بھی اسے کامیابی ملی۔ محمد شاہ ثانی کے دور میں اس کی وفات ہوئی بلکہ محمد شاہ ثانی نے اپنی ناسمجھی اور بہکاوے میں آکر انتہائی محسن اور وفادار وزیر، مہم جو سپہ سالار، کامیاب منتظم، فلاحی اور رفاہی کاموں کا منصوبہ ساز، علوم کا پرستار، اداروں کا بانی اور ملک التجار کو 14 اپریل 1481ء کو 76 سال کی عمر میں شہید کر دیا۔

تاریخ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کیا۔ پوری زندگی میدان جنگ میں گزار دی۔ فن حرب کے تمام رموز سے واقف اور جرأت و بہادری کی داستانیں رقم کرنے والے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خدمات انجام دینے اور اس کی سرپرستی کرنے والوں کی تعداد کم ہی نظر آئے گی۔ ایسے کمیاب لوگوں میں محمود گاواں کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے، وہ ایک بہترین عالم بھی تھا جس نے مروجہ علوم کی تحصیل کی، ریاضی اور طب کا ماہر تھا۔ نظم ونثر پر اچھی قدرت اور تحریر بڑی شگفتہ تھی۔ اس نے اپنے مکتوبات کو یکجا کر کے ''ریاض الانشا'' نام رکھا۔ فنِ انشا پر بھی ایک کتاب ''مناظر الانشا'' نام سے تحریر کی۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان بھی جمع کیا جس کا ذکر مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے

مضامین

کیا ہے۔ شعرائے فارسی سامعی اور ملانظیری کی وہ بڑی قدر کرتا تھا۔ مشہور شاعر ملا عبدالرحمٰن جامی سے محمود گاواں کے دوستانہ مراسم تھے۔ انھیں ایک منظوم خط لکھ کر بیدر آنے کی دعوت دی جس کا مطلع یہ ہے:

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا
الصّلا کہ از جان و دل نزل تو کردم مرحبا

جواب میں ملا جامی نے ایک قصیدہ بھیجا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود گاواں کی علم دوستی اور قدردانی سے دکن، ہندو بیرون ہند کے شعراء علما و ادبا نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کی عنایات سے مستفید بھی ہوتے رہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا فرشتہ نے اپنی تاریخ میں دیوان محمود گاواں کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ نایاب ہے۔ ہاں تذکرہ ''حدائق السلاطین'' اور ''ریاض الانشا'' میں اس کے کلام کے نمونے مل جاتے ہیں جس سے اس کی شاعری پر کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں ۔''ریاض الانشا'' میں اس کے تین قصیدے ملتے ہیں دو فارسی اور ایک عربی میں ہے۔ فارسی قصیدے کمال الدین اصفہان اور حکیم الدین الوری کے طرز پر جب کہ عربی قصیدہ بدیع الزماں ہمدانی کے تتبع میں اس نے لکھے ہیں۔ محمود گاواں کے کلام میں مبالغہ وتکلفات سے زیادہ حقیقت پسندی دکھائی دیتی ہے۔ تصوف کا رنگ بھی اس پر چڑھا ہوا ہے۔ قصائد میں چست بندش، روانی، پرشکوہ الفاظ، بلند پرواز اور تشبیہ و استعارہ کی کثرت موجود ہے جو کہ قصیدے کے لیے ضروری ہے۔ مگر کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرتی طور پر شاعر نہیں تھا بلکہ اساتذہ کے کلام کے تتبع کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اپنے خطوط کو اس نے جابجا اساتذہ کے کلام سے مزین کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔

''ریاض الانشا'' میں اس کے جو خطوط ہیں اس کے ہر جملہ پر فصاحت و بلاغت کی تعریف پوری طرح صادق آتی ہے۔ انداز بیان اپنے زمانے کی طرز کے مطابق ہے۔ آیات قرآنی، احادیث نبوی، ضرب الامثال، برمحل اشعار، حفظ مراتب کا خیال وغیرہ اس کے خطوط کو پرلطف بنا دیتی ہیں۔ ملا عبدالرحمٰن جامی نے اس کے انشا پردازی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

نظم و نثرش بیں کہ پنداری دبیر چرخ کرد
عقد پرویں را دراثنائے بنات النعش جا
یا خود افتاد است فخر و نات گنج پر گہر
بر بساط عرض بعضے متصل بعضے جدا
فقرہائے نثر او قوت دہ پشت ہنر
نکتہائے نظم اُو روشن گر شمع ذکا

اس زمانے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کا بڑا نقص یہ ہے کہ تھوڑے مضمون کو زیادہ الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ محمود گاواں کا حلقہ ارادت وسیع تھا۔ اس لیے اس کے خطوط سلاطین، امرا، علما، مشائخ، صوفیا، شعرا اور رشتہ داروں کے نام ملتے ہیں۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سب سے زیادہ انسیت ملا عبدالرحمٰن جامی سے تھی۔ ان کو محمود گاواں کبھی ہندوستان آنے کی دعوت دیتا ہے تو کبھی کوئی قیمتی تحفہ بھیج کر ان کے تئیں اپنے خلوص کا اظہار کرتا ہے۔

فنِ انشا پر محمود گاواں نے ''مناظر الانشا'' نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں ایک مقدمہ، دو مقالے اور ایک خاتمہ ہے۔ مقدمہ میں علم انشا کی تعریف، لوازمات اور غرض و غایت بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے مقالے میں اہل انشا کے طریقے پر کلام کی تقسیم اور دوسرے مقالے میں خطوط اور انشا کے شرائط و ارکان کو بیان کیا ہے جب کہ خاتمہ میں خط کی ماہیت اور ضوابط کا بیان ہے۔ اس کتاب میں محمود گاواں نے اختراعات کے بجائے اس فن سے متعلق عربی کتابوں کے اقتباسات کو فارسی تراکیب سے

مضامین

بیان کیا ہے۔محمود گاواں نے کلام کے محاسن کوتفصیل سے بیان کیا ہے۔صنائع وبدائع کی حقیقت،کلمہ وفقرہ کےفصیح ہونے کے شرائط وغیرہ کومثالوں سے بتایا ہے۔نثر میں اپنے عربی وفارسی کلام سے جبکہ نظم میں شعرائے عرب وعجم کے کلام سے مثالیں دی ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے اس کا مطالعہ وسیع اور استادوں کے کلام پرنظر عمیق تھی۔عربی میں اکثر مثالیں امراءلقیس،متنبّی،ابوالبرکات، ابن معتشر، ابن سکرہ ابی الاسود،قاضی فاضل مصری، قاضی عضدالدین وغیرہ کے کلام سے دی ہے اور فارسی میں اسدی، انوری،ظہیرفاریابی، سعدی،شرف الدین یزدی، جمال ترکی تبریزی،نظیری اورامیرخسرووغیرہ کے کلام کا حوالہ دیا ہے۔اس کے علاوہ موقع ومحل سے بادشاہوں کی حکایتیں، لطائف وظرائف بھی درج کیے ہیں۔منشی کی تعریف اوراس کے شرائط کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس کے بعدخطوط کی تقسیم کاتب اور مکتوب الیہ کے درجہ کے لحاظ سے بتایا ہے۔اس بات سے بھی باراٰورکرایا ہے کہ مکتوب کے کتنے ارکان ہوتے ہیں اورکتنی شرائط درکار ہیں۔یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ روزمرہ لکھے جانے والے معمولی خطوط کے بھی اس نے چودہ ارکان اور پندرہ شرائط بتائے ہیں جوبڑی دلچسپ ہیں مگر یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔یہ اس بات کا غماز ہے کہ اس زمانے میں انشااورخطوط میں تصنع کو اختیار کرنا عیب نہیں خصوصیت تھی۔یہی وجہ ہے کہ معمولی خط بھی اتنی قیود کی پابندی کے بغیرنہیں لکھے جاتے تھے۔دراصل ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے جب پورا سماج، رہن سہن، رکھ رکھاؤ،بودوباش،خوردونوش غرض زندگی کے تمام شعبوں میں تصنع کی گہری چھاپ ہوتوتحریروانشاپراس کا پرتولازمی ہے۔

محمود گاواں نے علمی کام کے علاوہ عملی کام بھی انجام دیے۔چنانچہ حصولِ علم کی خاطر 1472ء میں اس نے بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ کی بنیادرکھی۔افسوس ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکی کہ طرزتعلیم، ذریعہ تعلیم اور نصاب تعلیم کیا تھا۔کون کون سےمشہوراساتذہ کرام تھے۔تشنگان علوم کاتعلق کہاں کہاں سے تھااورانھوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔بہرحال عمارت کاتفصیل سے ذکرملتا ہے جونہایت مستحکم تھی اس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ مدرسہ کی عمارت مشرق ومغرب سمت میں 75 گز اورشمال وجنوب میں 55 گزتھی جس کے دومینار تھے۔ان میں سےایک مینار اب بھی موجود ہے جوکہ سوفٹ بلند ہے۔اس پرقرآنی آیات لکھی ہیں۔صحن میں مسجداور اطراف میں طلبا کےحجرے تھے۔کھانے اورکپڑے کا انتظام بھی طلبا کے لیے ہوتا تھا۔بلکہ فقرا،مساکین اورمسافروں کے لیےبھی لنگرتقسیم ہوتا۔بہرحال محمودگاواں نے بڑے خلوص سے یہ مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔سامی نے اس کی نیک نیتی کی شہادت ایک قطعہ میں دی ہے۔

این مدرسہ رفیع و محمود بنا
چوں کعبہ شدہ است قبلۂ اہل صفا
آثار قبول ہیں کہ شد تاریخش
از آیت ربّنا تقبّل مِنّا

☆☆☆

ڈاکٹرشمس الہدیٰ دریابادی
ایسوسی ایٹ پروفیسرشعبۂ اردو مولانا آزادنیشنل اردویونیورسٹی
گچی باؤلی حیدرآباد۔500032

محمودگاواں شہید پرقطعہ

شہید بے گناہ مخدوم مطلق
کہ عالم راز جو دش بود رونق
وگر خواہی تو تاریخ وفاتش
فرد خوان قصہ قتل بنا حق
سال فوتش گر کسے برسد بگوئے
بیگنہ محمود گاواں شد شہید

مشہورمورخ عبدالکریم ہمدانی

سرسید اور علی گڑھ تحریک

ڈاکٹر محمد یٰسین

انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے اختتام اور برطانوی حکومت کے باضابطہ قیام کے بعد جب ہندوستانی مسلمان سیاسی اور سماجی طور پر اضمحلال کا شکار ہوئے تو ان پر محرومی اور مایوسی کی شدید کیفیت طاری ہوگئی۔ حال یہ تھا کہ ہندوستان میں صدیوں پر محیط مضبوط سیاسی و سماجی نظام کی گرفت ٹوٹ چکی تھی۔ عام انسان تو کجا امیر اور رئیس، زمیندار و جاگیردار تک خودغرضی اور مفاد پرستی جیسے عناصر کا شکار ہو چکے تھے اور عام زندگی سے چین وسکون ختم ہو چکا تھا۔ چاروں طرف غریبی اور مفلوک الحالی کا دور دورہ تھا۔ مسلسل پریشانیوں کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو چکی تھی، قلب ونظر کی بصیرت و بصارت ختم ہو چکی تھی۔ اندھیرے اور تاریکی کے گھٹاٹوپ ماحول میں ضرورت تھی ایک ایسے رہبر کی جو اُن کو راستہ دکھائے۔ ضرورت تھی ایک ایسے مردِ مجاہد کی جو سوئی ہوئی قوم کو جگا سکے۔ اُن کے مردہ دلوں اور روح کو گرما سکے۔ ان کے اندر خود اعتمادی، عزت و توقیر کا جذبہ پیدا کر سکے۔ سرسید احمد خان نے اس صورتحال کے سدباب میں ایک حکمت عملی تیار کی اور اسے ایک مہم کے طور پر شروع کیا۔ بحیثیت مجموعی جسے علی گڈھ تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا تھا۔ سرسید قوم کی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

''جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، متانت سب چیز میں تنزل ہوتا ہے اور جو لوگ اس کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس چیز کا علاج کریں۔ دل ہمہ داغ داغ شد پنہ کجا کجا فہم..... مگر جب غور کی جاتی ہے تو بجز تعلیم وتربیت کہ کوئی اور اس کا علاج نظر نہیں آتا۔'' [1]

ہندوستان کے مسلم معاشرے کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا عمل حقیقی معنوں میں علی گڈھ ہی نے شروع کیا علی گڈھ تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس نے مسلم معاشرے کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ اس نے مسلمانوں میں مذہبی، تعلیمی اور تہذیبی اصلاح کی کوشش کی اور مسلم سیاست کو صحیح معنوں میں ایک جدید سمت عطا کی۔ سیاست کے میدان میں اس تحریک نے جو رخ اپنایا اور اس کے نتیجہ میں جو اثرات مرتب ہوئے اس سے پورا برِ صغیر متاثر ہوا۔

علی گڈھ تحریک کا مطالعہ پہلی ناکام جدوجہد آزادی کے پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ بغاوت دراصل زوال آمادہ مشرقی تہذیب ومعاشرہ اور سائنسی ایجادات پر مبنی جدید ترقی یافتہ اور سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب کے درمیان ایک جنگ تھی۔ جس میں مغرب کی فتح نے مشرق کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا اور سرسید و دیگر ہندوستانی دانشوروں کی نظر میں مغرب کی برتری ثابت کر دی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود اب اسی میں ہے کہ وہ تعلیم وتربیت کی ایسی راہیں اختیار کریں کہ جو جدید بھی ہو اور مغربی و سائنسی ایجادات کی نفی نہ کرتی ہو۔ نتیجہ میں سرسید نے مسلم معاشرے کو جدید تقاضوں سے روشناس کرانا چاہا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے وقت ان کی تقریر کے درج ذیل اقتباس میں اس درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو ان کے دل میں قوم وملت کے لئے تھا :

''جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے۔ اور اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا، وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں چھوٹی چھوٹی قومیں

مضامین

تھیں انھوں نے کیوں کر ترقی پائی اور کس طرح وہ ایک بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کے مانند ہوگئیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جو بڑی بڑی قومیں بڑے میوہ دار درخت کے مانند پھل پھول رہی تھیں وہ کیوں کر مرجھا کر سوکھ گئیں۔'' ۲

سرسید کی اس فکر نے جلد ہی ایک شکل اختیار کر لی۔ ان کی بے پناہ کوششوں کے صلہ میں ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کا قیام عمل میں آیا جو ۱۸۷۸ء میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کے نام سے مشہور ہوا اور رفتہ رفتہ پورے ملک میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اہم مرکز بن گیا۔ آگے چل کر یہی ادارہ ۱۹۲۰ء میں ایک یونی ورسٹی میں تبدیل ہو گیا اور آج بین الاقوامی شہرت کی حامل ''مسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی اصل داغ بیل مسلمانوں کے اندر علمی و تحقیقی ذوق و شوق بیدار کرنے کی غرض سے محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ڈالی تھی۔ سرسید اس سے قبل بھی مدرسے قائم کر چکے تھے اور سوسائٹیاں بنا چکے تھے اس لئے ان کو عملی تجربہ تھا۔ وہ بنتے اور بگڑتے ماحول کا بغور مشاہدہ کرتے اور ایسے رفقا کی تلاش کرتے جو ایک بے لوث سپاہی کی طرح ان کے ساتھ آجاتے۔ مخلص، علم دوست اور پر جوش کام کرنے والے جو بنتی بگڑتی فضا کو بھانپ لیتے اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے۔ علی گڈھ کالج محض ایک علامت تھا اس نئی زندگی میں داخل ہونے کا جو ہمہ وقت ایک دعوت بن گئی تھی۔ اس کے اندرون باب میں مختلف قسم کے کارواں داخل ہو رہے تھے۔ انھیں میں سرسید بھی ایک سالار کارواں کی طرح اپنے گرد و پیش کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنی دلی سوچ اور وقتی مطالبات کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف گامزن تھے۔ ان کی یہ دلی آرزو تھی کہ وقت نے جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں، ان سے گزر کر سماجی اور مادی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ یہی خواہش و جستجو اور اس کے سد باب کی تپش تھیں جسے ''علی گڈھ تحریک'' کہا جاتا ہے۔

عہد مغلیہ کا چراغ بجھتے ہوئے سرسید احمد نے خود دیکھا تھا۔ مسلمانوں کی بدحالی اور زوال پذیر زندگی کا نظارہ کیا تھا۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ نے جو آن بان بچی ہوئی تھی اسے بھی ختم کر دیا تھا۔ حالات نے ان کے دل کو بے حد متاثر کیا اور وہ اپنی عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مجبور ہوئے۔ سرسید احمد خاں اس وقت کے دیگر مسلمان رہنماؤں میں سب سے زیادہ غیور، بہادر، باعمل، جلد فیصلہ کرنے والے دانشمند، پر جوش، اور دور اندیش عقل پرست تھے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ غدر نے برطانوی حکومت کو مستحکم کر دیا ہے اور اب مسلمانوں کا آنے والا کل دشوار کن ہوگا تو انھوں نے برطانوی سرکار کے ملازم ہونے کے باوجود، جنگ آزادی کے نازک سیاسی پہلوؤں پر اپنا رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا سیّد احمد کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی یہ پہلی بھرپور کوشش تھی۔ انھوں نے بڑے عزم و استقلال اور جرائت کے ساتھ برطانوی حکومت کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا جس کی وجہ سے حالات اس حد تک خراب ہوئے اور لوگوں نے بغاوت کر دی۔ ہاشم قدوائی لکھتے ہیں :

''برطانوی حکومت کی ہندوستانی مسلمانوں سے بدگمانی کی بڑی وجہ اسلامی عقیدہ جہاد تھا انیسویں صدی کے نصف اول میں جہاد ہندوستانی مسلمانوں میں بہت مقبول تھا اور سید احمد شہید کی تحریک میں عام ہندوستانی مسلمان اس لئے شریک ہوئے تھے کہ یہ جہاد کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ اور سید احمد شہید اور ان کے پیروؤں کی تحریک سے حکومت کی اس بدگمانی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ سید احمد خاں نے برطانوی حکومت کی اس بدگمانی کو یہ کہہ کر دور کرنا چاہا کہ اسلام کی رو سے

مضامین

برطانوی حکومت کے خلاف جہاد جائز نہیں۔'' ۳؎

اسباب بغاوت ہند کے بعد ملک کی سیاست میں سرسید احمد کی اپنی ایک جگہ بن گئی۔انھوں نے اپنی ساری قوت انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی رشتے کو خوشگوار بنانے میں صرف کردیا۔اس کے لئے وہ تمام ذرائع اور وسائل اختیار کئے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تصورات، نظام اخلاق، اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی اور اشتراک پیدا ہو۔اس کوشش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ اپنے سیاسی تصورات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں ان کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے لائق ہے :

''ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت اور برابر رہیں اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہوجائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہوجائے گی۔'' ۴؎

سرسید احمد کی تحریک پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بھلائی کے خواہاں تھے اور اسی میں انھوں نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔مگر اس قسم کی باتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں۔وہ ایک سچے ہندوستانی تھے اسی خاک سے پیدا ہوئے اور اسی سرزمین کا پیوند بنے۔ ان کے پیش نظر اصل چیز وطنیت تھی اور اس لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر برادران وطن کو بھی اُسی قدر عزیز رکھتے تھے جتنا کہ انھیں مسلمانوں سے محبت تھی۔ وہ اس نظریہ کے حامی تھے کہ ہندوستان ایک ڈھانچہ ہے اس کی طاقت اور عزت دونوں ہندو اور مسلمان دونوں کے دم سے ہے۔اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو ہندوستان کی شہرت عام اور بقائے دوام ممکن نہیں ہے۔سرسید احمد کا اصلاحی مشن صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بلا کسی تفریق و امتیاز کے انھوں نے اپنی جدّ و جہد سب کے لئے جاری رکھی حالانکہ انگریزوں نے بعض وجوہ سے دیگر برادران وطن کو مراعات دے کر اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔اور اس اصول کو اپنا رکھا تھا کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' اس صورتحال میں وقت کا تقاضا بھی یہ تھا کہ سب کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور قومیت کے اس تصور کی تشہیر دے کر برادران وطن کو بھی اپنے انقلابی مشن میں ساتھ کرلیا۔ وہ دونوں قوموں کو لے کر آگے بڑھے۔سرسید احمد کی تحریروں میں جگہ جگہ قومیت کے تصور سے بحث کی گئی ہے۔اس سے ان کی مراد کبھی ہندو سے ہوتی تو کبھی مسلمانوں سے تو کبھی دونوں سے وہ اس طرح سے ہندو مسلم کے اندر اتحاد و یگانگت کی فضا ہموار کرنا چاہتے تھے تاکہ انگریزوں کا پیدا کردہ نفاق دور ہوسکے۔سرسید نے اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے :

''اے ہندو اور مسلمانوں! کیا تم ہندوستان کے سوا اور کسی ملک کے رہنے والے ہو۔کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی سرزمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھی اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے ایک قوم ہیں۔'' ۵؎

ملک اور قوم کے ان ناگفتہ بہ حالات نے دیگر دانشوروں کو بھی متاثر کیا اور انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ان میں زیادہ تر دانشور دہلی کالج سے وابستہ تھے جو آگے چل کر ''علی گڈھ تحریک'' کے بنیاد گزار اور سرسید احمد خاں کے رفیق کار بنے۔ دہلی کالج سے قطع نظر بھی متعدد حضرات و دانشور ان کے دست راست بنے ان میں حالؔی، شبلی اور محسن الملک وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔خواجہ الطاف حسین حالؔی نے تو سرسید

مضامین

برطانوی حکومت کے خلاف جہاد جائز نہیں۔'' ۳؎

اسباب بغاوت ہند کے بعد ملک کی سیاست میں سرسید احمد کی اپنی ایک جگہ بن گئی۔انھوں نے اپنی ساری قوت انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی رشتے کو خوشگوار بنانے میں صرف کردیا۔اس کے لئے وہ تمام ذرائع اور وسائل اختیار کئے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تصورات، نظام اخلاق، اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی اور اشتراک پیدا ہو۔اس کوشش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ اپنے سیاسی تصورات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں ان کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے لائق ہے :

''ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت اور برابر رہیں اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہوجائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہوجائے گی۔'' ۴؎

سرسید احمد کی تحریک پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بھلائی کے خواہاں تھے اور اسی میں انھوں نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔مگر اس قسم کی باتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں۔وہ ایک سچے ہندوستانی تھے اسی خاک سے پیدا ہوئے اور اسی سرزمین کا پیوند بنے۔ ان کے پیش نظر اصل چیز وطنیت تھی اور اس لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر برادران وطن کو بھی اُسی قدر عزیز رکھتے تھے جتنا کہ انھیں مسلمانوں سے محبت تھی۔وہ اس نظریہ کے حامی تھے کہ ہندوستان ایک ڈھانچہ ہے اس کی طاقت اور عزت دونوں ہندو اور مسلمان دونوں کے دم سے ہے۔اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو ہندوستان کی شہرت عام اور بقائے دوام ممکن نہیں ہے۔سرسید احمد کا اصلاحی مشن صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بلا کسی تفریق و امتیاز کے انھوں نے اپنی جدّ و جہد سب کے لئے جاری رکھی حالانکہ انگریزوں نے بعض وجوہ سے دیگر برادران وطن کو مراعات دے کر اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔اور اس اصول کو اپنا رکھا تھا کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' اس صورتحال میں وقت کا تقاضا بھی یہ تھا کہ سب کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔وہ اس میں کامیاب ہوئے اور قومیت کے اس تصور کی تشہیر دے کر برادران وطن کو بھی اپنے انقلابی مشن میں ساتھ کرلیا۔وہ دونوں قوموں کو لے کر آگے بڑھے۔سرسید احمد کی تحریروں میں جگہ جگہ قومیت کے تصور سے بحث کی گئی ہے۔اس سے ان کی مراد کبھی ہندو سے ہوتی تو کبھی مسلمانوں سے تو کبھی دونوں سے وہ اس طرح سے ہندو مسلم کے اندر اتحاد و یگانگت کی فضا ہموار کرنا چاہتے تھے تاکہ انگریزوں کا پیدا کردہ نفاق دور ہوسکے۔سرسید نے اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے :

''اے ہندو اور مسلمانوں! کیا تم ہندوستان کے سوا اور کسی ملک کے رہنے والے ہو۔کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی سرزمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھی اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے ایک قوم ہیں۔'' ۵؎

ملک اور قوم کے ان ناگفتہ بہ حالات نے دیگر دانشوروں کو بھی متاثر کیا اور انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ان میں زیادہ تر دانشور دہلی کالج سے وابستہ تھے جو آگے چل کر ''علی گڈھ تحریک'' کے بنیاد گزار اور سرسید احمد خاں کے رفیق کار بنے۔دہلی کالج سے قطع نظر بھی متعدد حضرات و دانشور ان کے دست راست بنے ان میں حالؔی، شبلی اور محسن الملک وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔خواجہ الطاف حسین حالؔی نے تو سرسید

مضامین

کی زبان میں گفتگو کی۔انھوں نے سرسید کی تحریک میں اپنی پوری طاقت وتوانائی صرف کردی۔اورقوم کی فلاح و بہبود کے لئے تعلیم کی طرف توجہ دلانے اورسماجی اصلاح کی طرف راغب کرنے کے لئے ایسی نظمیں لکھیں کہ انھیں پڑھ کرلوگ سر دھنتے ہیں اور اپنے حالات پرغور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ۔''مسدس مد و جزر اسلام'' کے بارے میں سرسید کہا کرتے تھے کہ جب روز قیامت اللہ تعالیٰ حساب کرے گا اور پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لے کر آئے ہو۔ تو میں کہونگا''مسدس مد و جزر اسلام'' ....

اس طرح سرسید احمد خاں نے اپنے تعلیمی مشن کو اور مضبوط بنانے کے لئے جب ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' شروع کی تو حالیؔ اس کے روح رواں بن گئے اور اپنی نظموں سے عوام میں بیداری پیدا کی ۔ اسی طرح اس تحریک کے دیگر اراکین اور رفقائے سرسید نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔لیکن سید احتشام حسین نے اس تحریک کا اجمالی تجزیہ پیش کرتے ہوئے بعض ملحوظ خاطر باتیں کہی ہیں :

''علی گڈھ تحریک ایک ہمہ گیرتحریک تھی یہ ہندوستان کے دورِ بیداری کا ایک اہم جز تھی،اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے چنگل سے نکلنا سکھایا تھا اس کے اصلاحی مشن نے طرز کہن پر اڑنے اور تعلیم نو سے ڈرنے سے بچایا تھا اس نے کسی حد تک جاگیر دارانہ تصور حیات سے نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف متوجہ کیا تھا۔لیکن اس کی تعمیر میں خرابی کی جوصورت مضمر تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ضرورت سے زیادہ حاکم طبقہ سے مدد لی گئی تھی اور اسے عوام کی پہنچ سے باہر رکھا گیا تھا۔جن عناصر کی مدد سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی تھی انھوں نے اس کے صحت مند پہلوؤں کو دبا کر محض وقتی فائدہ پہنچانے والے پہلوؤں کو ابھارا۔لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ ہندوستان کے تاریخی اور سماجی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔سرسید کے ادبی کارنامے''تہذیب الاخلاق'' اوراس کے جاندار نثر علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث ومباحثے،ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لکچروں کے مجموعے،خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی شاعری اورتنقیدی بصیرت،محسن الملک،ذکاءاللہ،چراغ علی وقارملک،سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے تحریک کی مخالفت کے باوجود شبلی کے ادبی اورعلمی شاہکار اوران سب سے بڑھ کر وہ زندہ،متحرک اورترقی پذیرفضا جوان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی یہ ساری چیزیں علی گڈھ تحریک کے دفترِ سل میں لکھی جائیں گی۔'' ۶

علی گڈھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں کی پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ان کے والد کا نام محمد تقی اور والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔سید محمد تقی کا تعلق مغلیہ امرا کے خاندان سے تھا۔سرسید احمد برطانوی حکومت میں مختلف جیوڈیشیل عہدوں پر فائز رہے۔انھوں نے لگ بھگ چار دہائی تک منصف صدر امین اورسب آرڈینیٹ جج کی حیثیت سے فرائض انجام دئے ان کا دائرہ کار آگرہ،دہلی اور ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے دوران بجنور اور علی گڈھ رہا۔

حواشی:

(۱) خطبات سرسید۔مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔صفحہ:۲۸۶۔۲۸۵

(۲) روداد نمبرا۔صفحہ:۲۳بحوالہ ارمغان علی گڈھ۔ از پروفیسر خلیق احمد نظامی صفحہ:۱۵۔۱۴

(۳) جدید ہندوستان کے سیاسی اورسماجی افکار۔ڈاکٹر ہاشم قدوائی۔ صفحہ: ۴۱

(۴) سرسید کے آخری مضامین۔صفحہ:۵

(۵) اسباب بغاوت ہند۔سرسید احمد خان صفحہ:۱۹

(۶) ذوق ادب اورشعور۔سید احتشام حسین صفحہ:۲۱۵

☆☆☆

ڈاکٹر محمد یٰسین

A-380،جی ٹی بی نگر کریلہ الہ آباد۔یوپی

MOB:9336084416

مضامین

نظیر احمد گنائی

حیدرآباد دکن کا تہذیبی پس منظر

قدیم حیدرآباد کا اپنا ایک منفرد کلچر تھا۔ یہ مغل دور سے احاطہ کرتا ہوا دکن میں بڑے زور شور کے ساتھ اثر انداز تھا۔ اس کلچر کا آغاز دور قطب شاہی سے شروع ہوکر آصف جاہی دور تک دکن میں اپنا بول بالا بڑے طمطراق کے ساتھ قائم رہا ہے۔ یہاں ہر فرقہ و مذہب کے لوگ ایک دوسرے کی عیدوں تہواروں تقریبوں اور خوشی اور غموں میں برابر سے شریک ہوتے تھے۔ یہاں دوستی کا ماحول، باہمی مدد و تعاون میں اپنی مثال آپ تھا۔ کیا راجہ کیا نواب سب کے سب یکجہتی کے علمبردار تھے۔ یہاں تعصب نہیں تھا۔ رعایا وفادار تھی۔ ماتحت اطاعت گزار، بالادست بے تعصب تھے۔ ہندوستان میں اتحاد تھا مسلم اولیاء کے مزاروں پر ہندو عورتیں گیلے بالوں سے طواف کرتیں۔ نذر و نیاز چڑھاتی تھیں۔ محرم میں الاؤ پر اور علم کی سواری پر یہی مناظر ہوتے تھے تو مسلمان ہندو فقرا اور بیراگیوہ اور گوسایوں کا منعقد تھا۔ دہلی لکھنؤ کے بعد ہندوستان کی ریاستوں میں حیدرآباد ہی سب سے بڑا تہذیبی مرکز رہا ہے۔ یہاں کی تہذیب منفرد خصوصیات کی حامل رہی ہے جس کو دکنی تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ رائے محبوب نارائن اپنی کتاب ''گذشتہ حیدرآباد'' میں حیدرآباد کی تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں:

''شہر حیدرآباد کی شہرت اس لیے نہیں کہ وہ سنگ و خشت اور خاک و گل کی فلک بوس عمارتوں کی ایک خوبصورت بستی سے عبارت ہے۔ وہ جگ میں اس لیے جانا پہچانا جاتا ہے کہ یہاں انسان بستے ہیں۔ ہاں انسان اصلی معنی میں۔ یہاں سیر و تفریح کی کوئی جھیل نہیں، یہاں تو تہذیب کا چشمہ اُبلتا ہے۔ یہاں کوئی آبشار نہیں مگر کوئی ایسا نہیں جو محبت میں سرشار نہیں۔ کسی سر بفلک پہاڑ کی برفیلی چوٹی بھی نہیں۔ مگر یہاں کا ہر بسنے والا بلند کرداری میں کوہِ طور سے کم نہیں۔ یہاں تو آسمان بھی زمین جھانکتا ہے، یہاں کوئی سمندر نہیں جہاں طوفان خیز موجیں ٹھاٹھیں ماریں، یہاں تو انسانی سینوں میں محبت کے طوفان موجزن ہیں۔ پیار اور انس میں ڈوبے ہوئے امن و خوش حالی کے ساحل خود ان کے حوصلے بناتے ہیں۔ یہاں طلوع و غروب آفتاب کی سنہری دھوپ کے مناظر نہیں۔ یہاں تو ستھرے مذاق کی سرخ شفق، پاکیزہ خیالات کی اجلی افق، حسن سیرت کی جگمگاتی کرنیں، انسانیت کو جلا دیتی ہیں۔ یہاں گلیلیں کرتی گنگناتی ندیاں نہیں۔ یہاں تو پیار اور پریم کے گنگ و جمن کی ملی جلی تہذیب کے لہریں مارتے ساگر ہیں۔۔۔۔۔ کتنی تہذیبوں کا سنگم ہے یہ شہر!!

یہاں زمانے کو بڑھاپا نہیں، اخلاق مائل بہ انحطاط نہیں۔ اسی دکن کی آب و ہوا کی دل فریبی پر بوڑھوں نے ترک دنیا کیا، ریاضت کی حسین دنیا بسائی، یہیں کے غاروں میں خانقاہ نشین ہوئے مگر واہ رے میرے وطن کی زمین کی اسی رنگین فضاؤں کی اندھیری گپھاؤں میں پتھر کو موم کیا۔ جمالیاتی ذوق نے حسین مناظر کو اُبھارے۔۔۔ رام ہو کہ پرسرام، اترے ہو کہ وتاترے، سیتا ہو کہ ساوتری، دمینتی ہو کہ رینو کا سارے پری رو اسی دل کے سرور اسی آنکھ کے نور تھے''۔ دکن از ہشت جنت جنت جنتے ہست [1]

فن تعمیر

حیدرآباد کی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں یہاں کی عمارتوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ یہاں کئی ایک تاریخی عمارتیں ہیں۔ اور عمارتیں فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں چند خاص قابل ذکر ہیں:

مکہ مسجد

اس کی تعمیر شاہی دور کے چھٹے حکمران سلطان محمد قطب شاہ نے کی۔ سلطان محمد قطب شاہ کو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ نے ایک مسجد تعمیر کی اور اس کا نام بیت رکھا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، مکہ شریف سے ایک پتھر منگوا کر اورنگ زیب نے اس مسجد میں نصب کرادیا اور اس کا نام مکہ مسجد رکھا۔

مکہ مسجد کی سنگِ بنیاد خود بادشاہِ وقت سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے ہاتھوں سے رکھا۔ ہندوستان کی اعلیٰ مسجدوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کی سنگ بستہ عمارت میں سنگ بے خار اور سرخ استعمال کیا گیا ہے جو بالا پور کی پہاڑیوں سے کاٹ کر لایا گیا تھا۔ پتھروں کی بڑی بڑی ستون کو بالا پور سے لانے کے لیے (۸۰) اسی بیل بیک وقت اس کو کھینچ کر لاتے تھے۔

قطب شاہوں نے کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ ان میں قلعہ گولکنڈہ، قطب شاہی گنبدوں، چار مینار اور اس کے اطراف جامع مسجد، گلزار حوض، چار کمانیں، خداداد محل، عاشور خانہ، دارالشفاء وغیرہ ان کی یادگاریں ہیں۔ بعد کے ادوار میں جامعہ عثمانیہ میر عثمان علی خاں کا کارنامہ ہے۔ کتب خانے آصف جاہی، ہائی کورٹ اور موتی محل وغیرہ ہیں۔ یہ ایسی عمارتیں ہیں جو ماضی حیدرآباد کی یادگاریں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مساجدوں کی تعمیر بھی میر عثمان علی خاں کے کارناموں میں شامل ہیں۔

شاہانِ آصفیہ کے دور کے تعمیرات کے سلسلے میں تمکین کاظمی یوں لکھتے ہیں:

''شاہانِ آصفیہ کے دور میں تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا۔ نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے دور میں ٹاون ہال (باغ عام) عدن باغ، ہائی کورٹ، دواخانہ عثمانیہ، شفاخانہ یونانی، کتب خانہ آصفیہ، عثمانیہ یونی ورسٹی، جوبلی ہال (باغ عام) نمائش گاہ (باغ عام) مسجد باغ عام، مسجد جودی وغیرہ سینکڑوں عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہ تھی حیدرآباد کی تاریخی اور تعمیری جھلکیاں''۔ [۲]

چار مینار

چار مینار نام سے ہی ظاہر ہے اس کے مینار چار ہیں۔ چار مینار کے بغیر ہم حیدرآباد کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ محمد قلی قطب شاہ کا شاندار کارنامہ چار مینار کی تعمیر ہے۔ اس کو شہر حیدرآباد کی سب سے اعلیٰ تاریخی عمارت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ عمارت سات لاکھ کے صرفے سے ۱۵۹۱ء میں تعمیر ہوئی۔ جو نہ صرف سارے ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی شہر حیدرآباد کی شناخت سمجھی جاتی ہے۔ اس کا دور حکومت دکنی اردو ادب کی ترقی کی وجہ سے نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ چار مینار مربع شکل کی عمارت ہے۔ جس کے چاروں کونوں پر مینار بنے ہوئے ہیں۔ اس کی مکمل اونچائی (۱۸۰) فٹ ہے۔ چار مینار اسلامی طرز تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے چار مینار چونے اور پتھر سے بنائی گئی یہ عمارت حیدرآباد کی شان ہے۔ اس عمارت کی تعمیر کے وقت فنکاروں کی صلاحیتیں اپنی معراج پر نظر آتی ہیں۔ اس لیے ماہرین اس عمارت کو ہندوستان کے سات عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔

چار مینار کے اطراف چار کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر کمان کے سامنے ایک بھرپور بازار مغربی کمان کی جانب لاڑ بازار واقع ہے۔ یہاں شادی بیاہ کے تمام سامان ملتے ہیں۔ چار مینار کی چوڑیاں سارے ہندستان میں مشہور رہیں۔ چار مینار حیدرآباد کی شناخت اور اس کی تہذیب کا نشان بن گیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ میں حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے چار مینار ۹۹۹ھ کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد چار کمان ۱۰۰۱ھ میں پھر عاشور خانہ کے ساتھ کے ساتھ محلات کی بنیاد ڈالی۔ شیر دل دروازہ جو آج کل سحر باطل کمان کے نام سے مشہور ہے۔ چار کمانوں کے اطراف چودہ ہزار دوکانیں ایوان سائبان اور اطراف بارہ ہزار محلے آباد کروائے۔ چار مینار کی تعمیر پر سات لاکھ خرچ ہوا۔ چار مینار کو بعض افراد دولت کی دیوی اور حیدرآباد کی قسمت کی دیوی کا مسکن کہتے ہیں۔ چار مینار کے حوالے سے پروفیسر آغا حیدر حسین مرزا اپنی کتاب ''حیدرآباد کی سیر'' میں لکھتے ہیں:

> ''نیچے کی منزل میں چاروں طرف ایک ایک محراب ہے۔ اس کے اوپر لداؤ کی چھت ہے اور دو منزلہ عمارت ہے۔ پہلی منزل میں سات محراب دار در

مضامین

ٹکسال میں کھڑے ہوکر دیکھیں تو نظر آتے ہیں۔ بیچ کے در میں گھنٹہ لگا ہے۔ تین تین در خالی ہیں۔ اسی طرح چاروں طرف چار گھنٹے لگے ہیں۔ دوسری منزل میں بھی محراب دار در ہیں جو گھنٹے کے اوپر کے در کو چھوڑ کر تیرہ ہیں۔ سات مغرب کی طرف سات مشرق کی طرف، اوپر کی چھت پر پردے کی منڈیر ہے۔ منڈیر میں گچی کی جالیاں ہیں۔ چار خانے کی جالی، لوزاتی جالی، ماہی پشت کی جالی، بند روم کی جالی، دیکھت بھولی کی جالی، تارے کی جالی، چنبیلی کی جالی کم از کم ساری عمارت میں کوئی سو سے بھی زیادہ جالیاں ہوں گی اور جتنی جالیاں اقلیدسی ہو سکتی ہیں وہ سب ختم کردی ہیں۔'' [۳]

مقبرے

قطب شاہی دور میں بنائے گئے مقبرے بھی فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان تعابر اور ان تعمیرات اور مقبروں کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ آج ہی یا ابھی بن کر تیار ہوئے ہیں۔ یہ اپنے وجود میں فن تعمیر کا اعلیٰ مرقع ہیں۔ یہ پتھر، گارے چونے اور گچی سے بنائی گئی تعمیرات جن میں گل بوٹے، پھول پتیاں، پرندوں کی شکلیں، قرآنی آیتیں، طغروں کی شکل میں کمانیں، محرابیں، گنبدوں سے پٹی پڑی یہ مقبروں کی عمارتیں فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہوکر اپنے صانع کی آج بھی یاد تازہ کردیتی ہیں۔

اس زمانے میں شاہوں اور خانوادوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنا گنبد بنالیا کرتے تھے۔ اس تعمیر میں اسلامی طرز کے ساتھ ہندو مندروں کے چھجے اور باب الداخلے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ حیات بخشی بیگم کی مسجد جو اس کے گنبد کے قریب ہی ہے پرندوں کی نمایاں اشکال موجود ہیں۔ قلعہ گولکنڈہ کے عقب میں آج بھی قطب شاہوں کا قبرستان جو گنبدان شاہی سے موسوم ہے مرجع خلائق ہے۔ ان مقبروں میں قطب شاہی اور پہلے بادشاہ قلی قطب شاہ جو قطب الملک کے نام سے مشہور ہے اس کا پہلا مقبرہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا مقبرہ اس کے جانشین قطب شاہی سلطنت کا دوسرا بادشاہ جمشید قلی کا مقبرہ ہے۔ اس کے بعد تیسرا بادشاہ سبحان قلی کا مقبرہ ہے اس کے بالکل متصل اس کے روبرو جو دتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کا مقبرہ ہے۔ پھر پانچویں بادشاہ بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ کا مقبرہ ملتا ہے۔ پھر اس کے بعد احاطہ گنبدوں کے باہر عبداللہ قطب شاہ کا مقبرہ پایا جاتا ہے۔ حیات بخشی بیگم کے مقبرے کے عین روبرو اس خاندان کے چھٹے بادشاہ سلطان محمد کا مقبرہ مرجع خلائق ہے۔

قطب شاہی دور کا طرز تعمیر ایرانی طرز تعمیر کا مرہون منت ہے۔ ایرانی معماروں نے فن تعمیر میں کمال صنائع و بدائع سے کام لیا۔ نقاشی، پچی کاری، چینی کاری اور لیپ سے کام لے کر اس قدر دیدہ زیب بنا دیا کہ آنکھوں میں وہ فن کھب جاتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے گنبدوں کی وضع چپٹے ہوئے اونڈے کیے ہوئے لگن کی سی ہوا کرتی تھی۔ بعد میں اس کو انار نما کر کے خوبصورتی لائی گئی اور پھر طرز تعمیر چل پڑا۔ زینت ساجدہ نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

''اس زمانہ میں اسلامی طرز تعمیر کا سرچشمہ دلی تھا۔ مگر یہ عمارتیں دلی کی عمارتوں سے بالکل الگ ہیں۔ اس وقت دلی کی عمارتوں میں یہ رعنائی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کی وضع، نفاست اور ندرت کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں ایران سے لاکر یہاں رکھ دی گئی ہیں۔ ان میں موزونیت اور تناسب اس بلا کا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے'' [۴]

بہمنی سلطنت دکن کی اسلامی سلطنتوں میں سے بڑی تھی۔ جب اس کی سلطنت میں استحکام ہوا تو ان کی توجہ علوم وفنون لطیفہ کی طرف ہوئی اور بہمنی دربار ایرانی، ترقی اور عرب شعراء، علماء اور اہل کمال سے بھرا رہتا تھا۔ ان میں صناعوں اور معماروں کی کمی نہ تھی۔ انہوں نے دکن کی تعمیرات میں ایک نئی روح پھونک دی اور نہایت شاندار عمارتیں بنائیں جو آج بھی فن تعمیر کا مرقع کہلاتی ہیں۔ قلعہ، گلبرگہ کی جامع مسجد، دولت آباد کا چاند مینار اور بیدر کا مدرسہ گاواں،

نوعیت کے لحاظ سے ملک میں اپنا جواب آپ ہیں ۔ لہذا ان طرز تعمیرات پر اسلامی فنون کی آمیزش بتوسط ایرانی ، ترکی ، عربی صناعوں کی وجہ سے وہی جھلک لیے ہوئے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب اس عظیم سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو یہ سلطنت پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئی۔ (۱) عادل شاہی ، (۲) قطب شاہی ، (۳) احمد شاہی ، (۴) نظام شاہی ، (۵) برید شاہی۔ ان میں قطب شاہی سلطنت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس کے استحکام کے بعد قطب شاہی سلاطین نے بھی فن تعمیر میں اپنی دلچسپی دکھائی۔

پندرھویں صدی عیسوی میں جب قطب شاہی حکومت کو استحکام نصیب ہوا تو اس وقت پورے علاقے میں کوئی اسلامی عمارت نہ تھی۔ سب سے پہلے اس سلطنت کے بانی قطب الملک قلی قطب شاہ نے قلعہ گولکنڈہ تعمیر کروایا۔ قلعہ کی تعمیر کے دوران جو سب سے پہلے عمارت تعمیر ہوئی وہ قلعہ کی مسجد تھی۔ جو جامع مسجد قلعہ گولکنڈہ کہلاتی ہے۔ البتہ اس کی دیواریں تغلق دور کے تعمیر سے متاثر تھیں۔ تغلق طرز تعمیر کی خصوصیت یہ تھی کہ دیواریں سلائی ہوئی تھیں اور گنبد کا بیرونی حصہ جھونک دار رہتا تھا۔ لیکن بہمنی دور کے معماروں نے اس بدنمائی کو دور کر کے گنبدوں کے پالوں اندرونی طور پر استحکام دے کر مخروطی طرز کو ختم کر دیا اور یہ اصلاحیں بہمنی طرز تعمیر قطب شاہی بلکہ ہندوستان کے فن تعمیر میں ایک مستقل عنوان بن گئی۔

''تغلق طرز کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ دیواریں سلائی ہوئی تھیں، ان میں یہ حکمت تھی کہ گنبد کا بیرونی جھونک تلا رہے۔ گلبرگہ کے معمار نے اس بدنمائی کو بھی دور کر دیا اور گنبد کے پایوں کو اندرونی طور سے اس قدر استحکام دیا کہ دیواروں کو مخروطی بنانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس قسم کی اور بھی اصلاحیں کیں۔ یہاں تک کہ بہمنی طرز تعمیر ہندوستان کے فن تعمیر میں ایک مستقل عنوان بن گئی''۔ [۵]

دھیرے دھیرے یہی طرز سکہ رائج الوقت بن گئی اور حیدرآبادی تہذیب کی شناخت بن گئی۔

حیدرآباد، شفاخانے کا رواج : علاج اور معالجے کے ضمن میں نہ صرف حیدرآباد اپنی مثال آپ تھا بلکہ اس سے قبل کے زمانہ میں یعنی قطب شاہی سے ہی اس کو شہرت حاصل تھی اور اس کی ایک مثال جس کے نام سے آج ایک محلّہ آباد ہے وہ تھا ''دارالشفاء'' جس میں تقریباً اس دور میں چار سو مریض بیک وقت ان پیشنٹ کی حیثیت سے شریک دواخانہ رہ کر علاج پاتے اور صحت یاب ہو کر گھر لوٹتے۔ یہ دواخانہ جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ تھا اس زمانے میں تقریباً سارے بلاد ہند میں اس نوعیت کا پہلا دواخانہ تھا جو تین منزلہ عمارت میں قائم تھا حاذق اطباء اور حکماء مفت علاج کرتے تھے۔ پھر مریضوں کے لیے طعام وغیرہ حکومت ہی برداشت کرتی تھی۔

اس دور کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے جب زمانہ آصف جاہی دور میں داخل ہوا تو میر محبوب علی خاں نظام ششم اور میر عثمان علی خاں نظام ہفتم نے بھی ان روایات کو اتنی وسعت بخشی کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔ چنانچہ عثمانیہ دواخانہ اور شفاخانہ چار مینار جہاں پر دو طریقہ علاج رائج تھے۔ ایلوپیتھی اور یونانی۔ ان دواخانوں میں قدیم اطباء اور حکماء نے شمالی ہند سے بعض ہنر مندوں اور عزیزوں کو جب بلایا کرتے تو ان کو مریض کی شکل میں داخل مطب کیا جاتا اور جہاں پر ان کی نگہداشت کے ساتھ رہائش اور طعام مفت مل جایا کرتا تھا پھر اس دوران ان کی کسی اسامی پر ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ یہ تھا اس دور میں ایک عام آدمی کے علاج کا ذمہ دارانہ طریقہ جو بلا تخصیص ہندو مسلمان سب کے لیے فراہم تھا۔

علاج : علاج کے ضمن میں جن ادویہ اور جڑی بوٹیوں کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ وہ اس طرح ہیں:

جس میں گھٹی، سونف، اجوائن، ملٹھی، اسیوہ، پھٹکڑی، اسبغول، نمک سیاہ، سونٹھ، کالی مرچ وغیرہ ضرور ہوا کرتے تھے۔ جن کے ذریعے مرض کی تشخیص کے بعد حسب مزاج و مرض دواؤں کو فوری حل کر کے تازہ کر کے دی جاتی تھی۔

یہ سدا علاج مفت اور بلا معاوضہ ہوا کرتا تھا۔ جا بجا شفاء

مضامین

خانے موجود تھے۔ دواؤں میں معجون، حلوے، قرص، سونف اور عرق دیا جاتا تھا۔ تمام دوائیں مفت مگر تیز بہدف ہوا کرتی تھیں اور مریض شفا پاتے۔

آبائی بیماریاں: ہیضہ اس زمانے میں ایک وبائی مرض بلکہ مہاماری کہلاتا تھا۔ یہ قدرے پیچیدہ علاج ہوا کرتا تھا۔ علاج کرتے کرتے ہی مریض کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ لوگ اس زمانے میں ترک مقام کر کے اونچے اور ہوادار مقام پر منتقل ہو جاتے تھے۔ لیکن اطباء اس کے علاج کی حتی المقدور کوشش میں جٹ جاتے مگر علاج کے ہوتے ہوئے مریض چل بستا اور یہی حال اس زمانے میں چیچک کے مرض کا بھی تھا۔

علاج: ''دواؤں کا ایک صندوق۔ گھٹی صندوق اس میں سونف، اجوائن، میتھی، ایلول، پھٹکری، بھلاواں، گھٹی کی جڑ، پادرہ نمک، سونٹ، کالی مرچ، گائی اوپن، ارنڈی کا تیل''۔ [۶]

اس طرح قدرتی علاج ہوا کرتا تھا اور لوگ صحت یاب ہوتے تھے۔

حیدرآباد کے کھیل کود اور تفریحات

پولو	فٹ بال	کرکٹ
ہاکی	ٹینس	تراکی

دیگر میدانی کھیل: متذکرہ کھیلوں کے علاوہ بھی کھیل ہیں۔ بخوف طوالت ان کی فہرست پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ میدانی کھیل نہ صرف اعلیٰ پیمانوں پر کھیلے جاتے تھے بلکہ ۱۹۳۰ء سے ان کی سائنٹیفک ٹریننگ اور کوچنگ وغیرہ کا انتظام ایک گریجویٹ کالج کی سطح پر موجود تھا۔ ان ترقی یافتہ کھیلوں کا ذکر محکمہ تعلیمات کے باب میں کتاب ہذا کی دوسری جلد میں ملاحظہ کیجیے۔ میدانی کھیلوں کے نام حسب ذیل ہیں:

بیڈمنٹن شٹل کاگ باسکٹ بال بیس بال جائنٹ بال
باکسنگ ٹملنگ ٹینی کائٹ کبڈی سائیکل پولو
وغیرہ

متفرق کھیل

ان کھیلوں کے علاوہ بہت سے متفرق کھیل ہیں مثلاً۔

لون پاٹ چرکی بلا سناخور ہنگورچہ اغل جھانپ
چوا میاں جانی کی گھوڑی
گلی ڈانڈل جھاڑو بندر پتھر پاشا لٹو تال بم بھڑ وچھب جا
بھڑ واتنا کونے کی بلی

لڑکیوں کے کھیل

آنکھ مچولی اپڑی کی تپڑی اندھی پاشا ہاپھو ہریا پھو
ایرک میرک ہنڈکلھیا گڑیوں کی شادی

چاندنی رات میں سوئی پرونا

گھریلو کھیلوں کی طرف ذہن دوڑتا ہے تو شطرنج، کشتی و پہلوانی، پنجہ کشی، گھوڑ دوڑ، شکار، تاش، پچیس کیرم بورڈ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، یہاں صرف شطرنج کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کی نمائش: اپنی مملکت میں تیار ہونے والی دیسی مصنوعات کو ریاست کی عام رعایا تک اس کی معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم نے ۱۹۳۷ء میں شہر حیدرآباد میں ملکی مصنوعات کی نمائش کا آغاز فرمایا۔ یہ نمائش ہر سال پہلی جنوری سے شروع ہو کر (۱۰) فروری تک ہوتی ہے۔ یہ نمائش نام پلی میں واقع ہوتی ہے۔ جس کا رقبہ (۱۴۲) ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے۔ نظام وقت نے اس زمین کو ایک نواب سے خرید کر اس کے لیے وقف فرمائی تھی۔ جس کا افتتاح ہر سال حضور نظام اعلیحضرت بذات خود فرمایا کرتے تھے۔ جس میں سارے ملک میں بن کر تیار ہونے والی تمام مصنوعات کی سجی سجائی دوکانیں اور اسٹالوں پر نمائش کی جاتی تھی۔ جو آج کل ہند صنعتی نمائش کے نام سے برابر جاری ہے۔

تفریحات: اس دور کا حیدرآباد آج کے حیدرآباد سے مختلف ہے۔ بلکہ بالکل مختلف تھا۔ گاہ بگاہ خوبصورت میناروں والے بنگلے، محلات، آرام گاہیں، مساجد، عاشور خانے، سرکاری و نیم سرکاری تعمیرات جو گچی، چونے اور گارے کے پتھروں سے بنی بارہ دریاں، برجوں، جالیوں والی شہ نشیں، بلا خانے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے اور جن کو

مضامین

دیکھنے کے بعد بھی بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنگ مرمر سے مرصع، سرخ و سیاہ چمکدار پتھروں سے مربوط در و دیوار تعمیرات پہلی بار دیکھنے والے کو حیران کر دیتے تھے۔ چناچہ جو بھی سیاح آتا تھا تعریفوں کے پل باندھتا تھا۔

حیدرآباد کی نمائش کا آغاز: ''۱۹۳۷ء سے شہر حیدرآباد میں نمائش مصنوعات ملکی ہر سال ہونے لگی جس کی افتتاح اعلحضرت حضور نظام بذات خود فرماتے۔ اسی نمائش کو اب کل ہند صنعتی نمائش نام رکھا گیا ہے۔ جو پہلی جنوری سے (۱۰) فروری تک ہوتی ہے'' ۷

کوہ نور ہیرا: قطب شاہی سلطنت کے حدود جنوب میں کولار تک وسیع تھیں۔ یہ مقام جو ہیروں کی پہاڑیوں اور سونے کی کان کے لیے مشہور تھا۔ جس کی شہرت آج بھی ہے۔ کھدائی کے دوران کئی ہیروں کی دستیابی ضرور ہوتی مگر دنیا کا مشہور ہیرا جو تاج برطانیہ جس کو ملکہ ایلز بتھ پہنا کرتی ہیں۔ ''کوہ نور ہیرا'' اس مقام سے نکلا اور گولکنڈے کی شہرت کو چہار دانگ عالم میں پہنچا دیا۔ چنانچہ کوہ نور ہیرے کی ملکیت بھی قطب شاہی سلاطین ہی کو حاصل تھی اور اس زمانے میں قلعہ گولکنڈہ ہیروں کی منڈی کہلاتا تھا۔ لہٰذا عرب، ایران، ترکستان وغیرہ ممالک سے سارے سوداگر ہیروں کی خرید و فروخت کے لیے گولکنڈہ آیا کرتے تھے۔

کوہ نور ہیرا۔۔۔۔ ہیرے کی منڈی

''حیدرآباد کے جنوب مکیں مجھ میں دور یہ قلعہ ہیروں کی منڈی کے طور پر بہت مشہور تھا۔ چنانچہ کوہِ نور ہیرا جو ملکہ برطانیہ کے سر کے تاج میں لگا ہے وہ گولکنڈہ ہی کا ہیرا ہے''۔ ۸

حیدرآباد کی غذا (اشیائے خورد و نوش)

قطب شاہی دور میں دکنی پکوان کو فروغ حاصل ہوا۔ نہ صرف ہمہ اقسام کے پکوان جیسے اموتا مرغ، جوکر سروان، جوکر مرغ، چاکنہ وغیرہ بلکہ مختلف اچار بھی روشناس ہوئے۔ قبولی جو کہ ایرانی پکوان ہے اسے فروغ دیا گیا ہے۔ قبولی جو ایک خاص قسم کی ڈش ہے اور جو صرف خاص کر محرم کے دنوں میں ہی پکائی جاتی ہے اور جس کا رواج آج بھی جوں کا توں ماہ محرم میں برقرار رہ کر جاری و ساری ہے۔

آصف جاہی دور میں پکوانوں کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ بادشاہ وقت نے ماہرین پکوان سے خوش ہو کر نہ صرف انہیں مال و زر سے سرفراز کیا بلکہ انھیں جاگیرات بھی عطا کیں۔ نظام ششم میر محبوب علی خان غفران مکان کے دور حکومت میں ماما جمیلہ کے پکوان کے ہر طرف چرچے تھے۔

اعلحضرت میر عثمان علی خان نظام ہفتم کے دور حکومت میں حیدر خان نے روز انسٹی چیوٹ قائم کر کے پکوان کو فروغ دیا۔ خانقاہی پکوان بھی جو حضرت خواجہ اجمیری اور صوفیاء کی دین ہے۔ خوب پروان چڑھا۔ امراء پائیگاہ کے دستر خوان پر متعدد اقسام کے کھانے ہوتے تھے جس میں لقمی کباب، سموسے، ورقی سموسے، روٹی، نان، رومالی روٹی، بریانی، پلاؤ، روغنی روٹی، شیر مال، پھلکا، پراٹھے وغیرہ وغیرہ۔

حیدرآباد میں جو غذائیں استعمال کی جاتی تھیں وہ بہت لذیذ اور مرغوب ہوتی تھیں۔ ان لذیذ پکوانوں میں ایک نام چاکنے کا بھی ہے۔ یہ چاکنہ حیدرآباد کی خاص غذا ہے۔ یہ اپنا ایک خاص ذائقہ رکھتا ہے۔ اس میں بکرے کا سر، کلیجی، اوجھڑی کا اور سردان ڈال کر پکاتے ہیں۔ اس کو جوار کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔

ناشتے میں اکثر کھچڑی، قیمہ، پاپڑ، انڈے، تلا ہوا گوشت اور پراٹھے، روغنی روٹی، ڈبل روٹی مسکہ، چٹنی، اچار، بڑیاں یہ ساری چیزیں یا ان میں سے کچھ نہ کچھ ہر دن دستر خوان پر ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بعض اوقات نہاری، روٹی، کلیجے، کھڑی دال، چپاتی ناشتے میں پکائی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں یہاں کا ناشتہ بازار ہی سے نہاری اور شیر مال لاتے تھے۔ اس معاملے میں سب یکساں نظر آتے تھے۔ دوپہر کے کھانوں میں گھر گھر دستر خوان پر بگھارے بیگن، قورمہ، دالچہ، کھٹی دال، شامی، شکم پور، دو پیازہ وغیرہ ان میں

سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا اور کھانے میں طرح طرح کے چاول جیسے بگھارا کھانا، نہاری اور سادہ چاول بھی ہوا کرتا تھا۔ دعوتوں میں چاول کا استعمال اکثر ہوتا تھا۔ مثلاً بگھارا کھانا، پلاؤ، بریانی، نہاری، انڈا، مرغا، مچھلی اور کوفتوں سے سجے دسترخوان ہوتے تھے۔

دالچہ حیدرآباد کے خاص پکوانوں میں شامل تھا۔ دالچہ اکثر کدو کا بنتا تھا۔ اس میں بیگن ٹماٹر بھی شامل کرتے تھے۔ تل کی چٹنی بھی حیدرآباد کی خاص چیز تھی۔ دہی کی کڑی بھی حیدرآباد میں بڑے شوق سے پکاتے اور کھاتے تھے۔ چاول کی کڑی یعنی کھٹی کڑی جس میں گوشت، آلو، ٹماٹر منگے کی پھلی ڈال کر پکائی جاتی تھی۔ یہ خاص حیدرآبادی پکوان تھی اور صرف یہیں پکائی جاتی تھی۔ مرغ کا سالن، قورمہ، دالچہ، بریانی وغیرہ حیدرآباد میں لوگ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ انباڑے کی بھاجی بھی حیدرآباد کے ہر گھر میں گوشت اور چنے کی دال کے ساتھ روزانہ پکائی جاتی تھی۔ کباب، پسندے، دوپیازہ، روسٹ مٹن، مٹن چالیس یہ بھی دکنی، حیدرآبادی قدیم پکوانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جن کا رواج آج تک جوں کا توں حیدرآباد بلکہ سارے دکن میں رائج ہے۔

عہد قدیم سے رائج پکوان:

ناشتے میں کلیجی، کھچڑی، پراٹھے، قیمہ، نہاری، میٹھی دال، جس میں بگھاری ہوئی پیاز خوب گھی کے ساتھ ہوئی، خاگینہ چٹنی بکرے کے کباب، پاپڑ، بڑیاں، مٹکہ کا دہی، جو اس شہر میں رائج تھے آج بھی اس کا چلن بالکل خاص و عام جاری ہے۔

دوپہر کے کھانے میں یہ اقسام رائج تھے۔ مثلاً خشکہ، پراٹھے، چپاتی، خمیری روٹی، اور قسم بہ قسم کے سالن اور کباب ہوا کرتے تھے۔ ان سب کا چلن آج بھی قائم ہے۔

دکن دیس (ایشائے خوردونوش)

''تاریخ گلزار آصفیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کے باورچی خانہ سے روزآنہ دوسو آدمی ان کے اقربا اور متوسلین کھانا کھایا کرتے تھے۔ روزانہ خستہ روٹیاں کباب اور شکم پور، صبح میں اور شام کو لذیذ اور عمدہ قلیہ دمزعفر گلاب مشک و زعفران پڑا ہوا اور کباب اور ورقی سموسے، اچار مرغے بھجوائے جاتے تھے''۔ ۹

غذا:

''روزہ رکھائی میں غذا یا پکوان (عام لوازمے) بریانی زعفرانی، مرغ پلاؤ، صوفیانی مرغ مسلم، شیخ کباب، شکم پور، لقمیاں، نان، بگھارے بیگن، کٹ دہی کی کڑی، دہی کی چٹنی، بورائی، آلو قورمہ، شب دیگ، بادام کا حلوہ، بادام کی لوزیا جالی، گاجر کا میٹھا، سیویوں کا مزعفر، کنڈ گل بہشت، شیر خاما، عام لوازمے تھے''۔ ۱۰

دوسری جگہ:

''ناشتے میں کلیجے، کھچڑی، پراٹھے، قیمہ، نہاری، میٹھی دال جس پر بگھاری ہوئی پیاز خوب گھی کے ساتھ ہوئی، خاگینہ، چیلے، اچار، چٹنی، بکرے کے سوکھے کباب، پاپڑ، بڑیاں، مسکہ، گھی، شہد حسب حیثیت'' ۱۱

اشیائے خوردونوش:

''پاؤ سیر گوشت ملتا اور اگر مغرب کے قریب تک دوکان پر گوشت رہ گیا تو باسی ہوجانے کے ڈر سے (۵) پیسے پاؤ سیر (۵) ہی گنڈے سیر کا زور زور سے اعلان کرتا۔ دودھ روپے میں (۸) سیر، میدک کے مشہور باریک چاول جو پلاؤ کے لئے بڑے شوق سے لیے جاتے تھے ۲۵ تا ۳۵ پلہ تک دستیاب ہوجاتے تھے''۔ ۱۲

محرم کی غذا:

''محرم میں سکھ مکھ، قہوہ، روٹ چونگے، بُستی، کھچڑی، قبولی اور قسم قسم کے شربت پہلی محرم سے زیارت تک بنائے جاتے۔'' ۱۳

مضامین

تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

''محرم میں تو روزانہ کھچڑی پکتی اور امامین کے فاتحہ ہوتے اوٹ، چونگے کھچڑی، حلیم بھی پکتے ہیں۔'' [۱۴]

کھچڑی:

کھچڑی کا نام لیتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ ناشتے کے لیے بنی ہے۔ کھچڑی ایسی لذیذ اور ذائقہ دار غذا ہے جیسے بچے ہو کہ بوڑھے جوان ہر کوئی بڑے شوق سے نوش فرماتے ہیں۔ حیدرآبادی کھچڑی پکانے اور کھلانے کا طریقہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں رائج تھا۔ حیدرآباد میں اکثر محرم میں پہلی محرم سے زیارت تک کھچڑی پکائی جاتی ہے۔ کھچڑی کے بڑے فائدے بھی ہیں جیسا کہ بیمار کو کھچڑی کھلائی جاتی ہے۔ ناشتہ میں بچے کی چھٹی میں، چھلے، شادی عقد کے دوسرے روز غم کے موقع پر کھچڑی ہی پکاہی جاتی اور کھلائی جاتی ہے۔ بچے کی چھٹی چھلے کے موقعہ پر کھچڑی پکار کر پانچ، سات، نو، گیارہ، گھروں میں بھیجی جاتی ہے۔ حیدرآباد کے قدیم گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ روزانہ چاول پکاتے تو کسی برتن میں ایک مٹھی چاول الگ ڈالتے ہیں اور ہر مہینے کی نوچندی جمعرات کو ان چاولوں کو کھچڑی پکار کر فاتحہ دے کر کھاتے ہیں۔

کھچڑی پکا کر اس پر نذر و نیاز بھی کرتے ہیں اور اکثر عیدوں تہواروں پر بھی کھچڑی ہی پکا کر کھالیتے ہیں۔ کھچڑی کم وقت میں پکتی ہے اور جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔ ناشتے میں اکثر کھچڑی، قیمہ، پاپڑ، انڈے، تلا ہوا گوشت، پراٹھے، روغنی روٹی اور ڈبل روٹی ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تہاری، کھٹی دال یا میٹھی دال ناشتے میں پکائی جاتی تھیں۔ گرم گرم کھچڑی ناشتے میں قیمہ اور اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اس پر پاپڑ تو سونے پے سہاگہ کا کام کرتے ہیں۔

حلیم

حلیم، یہ حیدرآباد میں خاص ایرانی ہوٹلوں میں ملتی ہے۔ حیدرآباد کا نام آتے ہی حلیم کا ذکر بھی آنا چاہیے۔ حلیم ایک مقوی اور صحت بخش غذا ہے۔ اسے اکثر رمضان میں افطار کے وقت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ حلیم کی تیاری میں گیہوں، مٹن اور مختلف قسم کے دالوں اور مسالحہ جات استعمال کرتے ہیں۔ حلیم میں ''بنے نواب حلیم بھی ہے''۔ حیدرآباد کے بہت سارے ہوٹلوں میں اکثر ملتی ہے۔

حلیم کی قسمیں

کشمیری حلیم، زم زم حلیم، بادامی حلیم اور ایرانی حلیم یوں تو حیدرآباد میں پستہ ہازو کی حلیم بہت مشہور ہے۔ یہ بیرونی ممالک کو بھی بھیجی جاتی ہے۔

پان اور پاندان

قدیم زمانے سے ہی پان کا استعمال فائدہ مند سمجھا گیا ہے۔ پان گھریلو طبی ضروریات کے لئے بھی کارآمد ہوتا تھا بعد میں پان جمالیاتی اغراض کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ دکن میں یہ رواج ابتدا سے ہی ہوکر چلا آیا ہے کہ محفلوں، تقاریبوں، مجلسوں، کانفرنسوں، ادبی سیمناروں، شادی اور مختلف مراسم میں لوگ اس کا بھرپور مزہ لیتے تھے۔ آج بھی رسم منگنی، شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں پان کا چلن عام ہے۔ کچھ تقاریب ایسی بھی ہیں جن میں پہلے پان لے دے کر رسومات انجام دی جاتی ہیں۔ پان کے استعمال میں آنے والی دیگر اشیاء مثلاً چونا، کتھہ، لونگ الائچی، زعفران، جوز، جوتری، چاندی کا ورق اور ذردہ وغیرہ رکھنے کے لئے مستعمل ایک خوبصورت ڈبہ جس کو پاندان کہتے ہیں۔ ڈبہ منقش بعض چاندی کے بھی پاندان ہوا کرتے تھے۔ محلوں، بیگمات اور منسوب گھرانوں میں خاص مقصد کے لیے استعمال میں رہتے تھے۔ جو خاص دکنی اور حیدرآبادی تہذیب کی ناز ہوا کرتے تھے لیکن اب ان کا چلن خال خال ہی باقی رہا۔ ''تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن'' میں ابو ظفر موئیدالدین حسن فاروقی اس طرح لکھتے ہیں۔

''مہاراجہ کشن پرشاد کی محفل میں ایک مسلمان نے کریم نگر کی خاص صنعت سے بنے ہوئے نقروی پاندان سے پان کھاتے ہوئے پاندان کی تعریف کی جب یہ چلنے لگے تو مہاراجہ

مضامین

بہادر نے پاندان ان کو تحفہ دیا۔ مگر اصرار کے ساتھ پاندان کی سواری میں رکھ دیا گیا۔'' ۱۵

پان کا استعمال

سیدہ جعفر نے کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتب کر کے مقدمے میں پان کے حوالے سے یوں لکھا ہے۔

'' محمد قلی عود اور عنبر کا ذکر کرتا ہے۔ وہیں یہ چندن کدم اور مل کو نہیں بھوتی۔

اکثر ہندوستانی مرد اور عورتیں پان کی عادی ہوتی ہیں۔ دکن میں پان کا بیڑا دینا عزت و توقیر کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔'' ۱۶

عید جشن اور شادی کے موقع پر پان کے بیڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ جلوہ اور دیگر رسومات میں اس کا استعمال عام تھا۔ دکنی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ پان اور پاندان کے بارے میں فاضل مصنفوں نے اپنی نگارشات میں اس زمانے میں حیدرآبادی تہذیب میں رائج پان اور پاندان کے بیڑوں و پاندان کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں ہر گھرانے میں پان کھانے کا رواج اور پاندان ہوا کرتے تھے۔ گھر آنے والوں کے بعد ضیافت صاحبِ خانہ پان کے بیڑوں سے تواضع کرتے۔

بیگم خانہ پان بنا بنا کر چھوکری کو دیتی اور بیڑوں کو حاضرین میں تقسیم کرتے ہوئے سلام بجالاتی تھی۔

پاندان، ایرانی، عربی، ترکی وضع کے نقروی، گنگا جمنا چاندی کے منقش پاندان ہوا کرتے تھے۔ جست اور بیدری کام کے بھی پاندان ہوا کرتے تھے۔

آخر الذکر حیدرآبادی تہذیب کے جتنے پہلوں پر بات کرنی تھی نہ ہوسکی۔ مقالے کی گنجائش کو دیکھ مختصراً چند تہذیبی پہلوں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

حوالہ جات

(۱) گذشتہ حیدرآباد، رائے محبوب نارائن، مئی ۱۹۸۵ء، ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، ص ۲۵۔۲۶۔۲۷
(۲) حیدرآباد کبھی ایسا بھی تھا، تمکین کاظمی، ص ۱۶
(۳) حیدرآباد کی سیر، مضامین پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا (مرتبہ، مہرالنساء معظم حسین، مارچ ۱۹۹۷ء) ۸۷۔۸۸
(۴) حیدرآباد کے ادیب (جلد دوم) زینت ساجدہ، ص ۳۶۰
(۵) حیدرآباد کے ادیب (جلد دوم) زینت ساجدہ، ص ۳۶۶
(۶) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۲۷۲
(۷) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۲۲۷
(۸) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۲۲۷
(۹) حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب، اقبال جہاں قدیر، ص ۲
(۱۰) میر عالم۔۔۔باورچی خانہ، تمکین کاظمی، ص ۲۵
(۱۱) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن، ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۱۷۱
(۱۲) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن، ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۲۵۷
(۱۳) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن، ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۳
(۱۴) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن، ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۸۹
(۱۵) حیدرآباد کبھی ایسا بھی تھا، تمکین کاظمی، ص ۳۲
(۱۶) تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن ابوظفر موئیدالدین حسن فاروقی، ص ۲۱

نظیر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی فون نمبر: 7889779687

محبت کی تمنا ہے تو پھر وہ وصف پیدا کر
جہاں سے عشق چلتا ہے وہاں تک نام پیدا کر
اگر سچ ہے میرے عشق میں تو اے بنی آدم
نگاہِ عشق پیدا کر جمالِ ظرف پیدا کر

علامہ اقبالؒ

مضامین

''راجدیو کی امرائی'' میں صادقہ کی سحر کاری

ڈاکٹر قسیم اختر

صادقہ نواب سحر نے اپنے ناولوں کے نئے موضوعات اور کہانی کے فن کارانہ برتاؤ کی وجہ سے قاری کا اپنا حلقہ بنالیا ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے مگر اس برق رفتار دنیا نے فکشن کے قارئین کو بھی متاثر کیا ہے۔ جس طرح فکشن لکھنے والوں کے یہاں موضوعاتی تناظر میں ایک بکھراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے اسی طرح قارئین بھی انتشارِ ذہنی کا شکار ہیں۔ اس کیفیت میں قارئین کا اپنا ایک حلقہ بنانا کوئی آسان کام نہیں مگر صادقہ نواب سحر نے اپنی جادوئی نثر اور سحر انگیز اسلوب سے قارئین کے ایک بڑے حلقے کو اپنے فن کا گرویدہ بنا لیا جو موجودہ عہد میں ایک تخلیق کار کے لیے بڑی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول ''راجدیو کی امرائی'' پر لوگ توجہ مبذول کررہے ہیں اور اس پر ایک سے ایک رائے سامنے آرہی ہے۔ صادقہ نواب سحر کے اس ناول کی طرف التفاف اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ برق رفتار دنیا میں بھی قارئین تخلیقی ادب کے لیے وقت نکال سکتے ہیں مگر شرط ہے کہ فکشن نگار دل جمعی سے انوکھے موضوعات پیش کرے۔ صادقہ نواب سحر نے نہ صرف تخلیقات پر توجہ دی بلکہ قارئین کی نفسیات کا بھی بھرپور مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناول، افسانے، ڈرامے اور شاعری میں ایسے موضوعات ومسائل کا تخلیقی تجزیہ کررہی ہیں جن میں آج کا سماج بسا ہوا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ صادقہ نواب سحر نے نہ صرف سماجی موضوعات کا محاکمہ کیا بلکہ قارئین کے ذہن ودماغ سے بھی قربت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

ناول ''راجدیو کی امرائی'' صادقہ نواب سحر کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' اور ''جس دن سے'' جیسے ناولوں سے اپنی انفرادیت ثابت کی۔ ''راجدیو کی امرائی'' بھی ان کا ایک ایسا ناول ہے جس کے بہت سے پہلو نہ صرف قارئین کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ ناقدینِ ادب کو دعوتِ قرأت بھی دیتے ہیں۔ صادقہ نواب سحر کے پیش نظر ناول ''راجدیو کی امرائی'' کی یہ خصوصیات ہمیں متوجہ کرتی ہیں:

اول: سوانحی تناظرات' دوم: تاریخ وتخلیق کا ادغام' سوم: طبقاتی کشمکش' چہارم: محنت کا پیغام' پنجم: اقدار کی کشمکش' ششم: تہذیبی معاملات کا نوحہ

پیش نظر ناول ''راجدیو کی امرائی'' میں کہانی کی پیش کش کا معاملہ جداگانہ ہے۔ کیوں کہ صادقہ نواب سحر نے اکہرے انداز سے واقعات کو پیش نہیں کیا بلکہ کہانی کہنے کا ایک نیا ڈھب اپنایا ہے۔ اگر وہ چاہتیں تو راجدیو کے گھرانے کے واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کردیتیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور متعدد ذیلی واقعات سے بھی ناول کو دل چسپ بنانے کی کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کی کڑیاں جوڑنے میں انھوں نے فن کاری کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ واقعات ناول کا اٹوٹ حصہ بنتے چلے گئے۔ ناول کی قرأت کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اور موجودہ عہد کے بیانیہ سے الگ اپنی شناخت قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے مکالموں کے درمیان کئی بنیادی نکات کی طرف اشارے بھی کیے ہیں:

''سمجھ میں نہیں آتا ہے، دیش میں تعلیم پر اتنا زور کیوں نہیں دیا جاتا جتنا کہ مذہب! جتنی کہ ضرورت ہے! ہر مذہب والا اپنے دھرم کی پریکٹس اپنے ڈھنگ سے کرتا ہے۔ لوگ کہیں کہ دین سیکھ لیں تو دنیا سنور جاتی ہے۔ صحیح ہے۔ میں دنیادار آدمی ہوں۔ سوچتا ہوں۔ دنیا کی تعلیم مل جائے تو دین کو خود ہی پڑھ لوں۔ پڑھ کر سمجھ لوں۔ کسی کے بہکاوے میں نہ آؤں۔'' (راجدیو کی امرائی، ص40)

مذکورہ اقتباس میں یہ بات بھی اہم ہے کہ صادقہ نواب سحر نے سیاسی دھمک کو انتہائی پرسکون لہجے میں پیش کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جملوں میں خطیبانہ احساس بسا ہوا نہیں ہے۔ ان چند جملوں میں ملکی

سیاست، مسلکی خرافات، تعلیم کی ناقدری اور ذاتی ناپسند و پسند کا معاملہ بہتر طریقے سے پیش کر دیا گیا۔ یہ چند جملے معاشرے پر طنزیہ تناظر میں ابھر رہے ہیں کہ ہم بنیادی مسائل سے پہلو تہی اختیار کرتے ہیں اور فروعی معاملات میں الجھ جاتے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ مذکورہ جملوں کی اہمیت اور زیادہ مسلم ہوگی۔ کیوں کہ تخلیقات میں پیش کئے گئے ایسے جملوں سے مستقبل میں تہذیبی مطالعہ اور ملک کی ناگفتہ بہ صورتحال کی کڑیاں جوڑی جائیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے اشاروں سے تخلیقات میں دستاویزی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ صادقہ نواب سحر نے اپنی تخلیقات میں دستاویزی کیفیت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی تخلیقات سے فکر و خیال کی نئی جہتیں سامنے آئیں گی اور تخلیقی مورخ لامحالہ ان کی تخلیقات سے استفادہ کرے گا۔

صادقہ نواب سحر نے ''راجدیو کی امرائی'' میں کرداروں کی نفسیات اور سماجی صورتحال کا جو جائزہ پیش کیا، اس میں سماج کے دیگر کمزور طبقے کے لیے پیغام بھی ہے۔ کیوں کہ راجدیو کے خاندان نے اپنی سماجی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے بہت سے کام کیے۔ اسی گھر کا فرد کوکاتا جاتا ہے۔ ریلوے میں ملازمت کرتا ہے اور اسی ملازمت کے سہارے زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے، مگر رفتہ رفتہ اس گھرانہ پر حالات آتے ہیں اور ''امرائی/باغیچہ'' تک کو فروخت کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ کہانی کے بیانیہ میں وہ سین بھی اہم ہے کہ اس گھرانے سے جڑا ہوا ایک بھائی دوا اسٹور شروع کرتا ہے اور دوسرا ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ پھر ڈاکٹر اور دوا کی دکان کے معاملات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو صادقہ نواب سحر نے چھوٹے چھوٹے واقعات میں سماجی طنز اور حقیقتِ حال کا نقشہ بڑی عمدگی سے کھینچا ہے۔

اس ناول میں پیش کی گئی کہانی سے کئی پیغامات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اول، لاغر و کمزور فیملی تھوڑی توجہ سے اپنے حالات بہتر کرسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حالات کے جبر کا فقط نوحہ نہ کیا جائے۔ صادقہ نواب سحر نے ماضی اور دگرگوں حالات کا تذکرہ کیا۔ اس کا نوحہ کیا ہے مگر اس نوحے کو طوالت سے محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالات کے نوحے میں درد کے ساتھ ساتھ ہمت اور حوصلہ مندی کا سبق بھی پیدا ہو گیا۔ اگر صادقہ نواب فقط نوحے اور حالات سے شکایت کا پہلو ابھارتیں تو ناول میں نہ پیغام کا کوئی عنصر پیش کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی فنی مہارت کا احساس پیدا کیا جاسکتا تھا مگر انھوں نے ایک سچے اور ہنر مند فن کار کی طرح اپنی تخلیقات میں کئی پرکشش واقعات کو مدغم کر دیا ہے۔ اس ناول کو دل چسپ بنانے میں ذیلی عناوین بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناوین کے تحت چھوٹے چھوٹے واقعات ناول میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ناول ''راج دیو کی امرائی'' کا سوانحی پس منظر بھی ہے مگر اس کو فقط سوانحی حالات سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے سوانحی اثرات کو روزنامچے کے احساسات سے لیس کر دیا ہے۔ یہی ان کی فن کاری ہے۔ موجودہ عہد میں بائیو فکشن کا گراف بڑھ رہا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں جھانکتے ہوئے لوگوں کو فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ صادقہ نے ہمیں ایک بڑی فیملی کی زندگی میں جھانکنے کا موقع دیا ہے اور انھوں نے ناول میں ایسے حالات پیش کیے گئے ہیں کہ یہ جھانکنا منفی تناظرات نہیں رکھتا ہے بلکہ ہم اس فیملی کی زندگی میں جھانک کر اصلاحی پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہیں۔ پیغامات اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو گویا انھوں نے سوانح کو ڈائری، پھر پیغامات و اصلاحات سے جوڑ دیا ہے۔ صادقہ نواب سحر کی ہنرمندی یہی ہے کہ وہ نہ موضوعات کے بیان میں اکہرا رویہ اپناتی ہیں اور نہ ہی تکنیکی تناظر میں کسی ایک پہلو سے اندازِ پیش کش کو تہہ دار بناتی ہیں۔ بیک وقت وہ تکنیکی اور موضوعاتی متعدد انسلاکات و تناظرات سے اپنے فکشن کو لیس کر دیتی ہیں۔ ذیل میں ہم چند اقتباسات پیش کریں گے اس ناول کے دیگر ابعاد کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ صادقہ نواب سحر کا اسلوب تحریر بھی سامنے آئے اور ان کی لفظیات بھی:

مضامین

''ابھی ہمیں ایمسٹرڈم سے لوٹے ہوئے تین ہی مہینے ہوئے تھے۔ اس دن میں جلدی نکل گیا۔ اونتکا سے جلدی جلدی صفائی کروا رہی تھی۔ آج بائی دیر سے آئی تھی۔ اسے کہیں جانا تھا۔ وویکا نند کینڈر کے لوگ اپنے ایک پرانے ممبر کی میت میں جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ لوٹتے لوٹتے ساڑھے پانچ بج گئے۔ بھارت نواس سے گزرتے ہوئے میری نظر بلڈنگ سے باہر آتی ہوئی خاتون پر پڑی۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا رہی تھی اور مسکراتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھا۔'' (راجدیو کی امرائی، ص89)

اس اقتباس سے اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ صادقہ نواب سحر کے بیانیہ میں ایک بہاؤ ہے۔ کہانی کو پرکشش بنانے میں ان کے سادہ بیانیہ کا اہم کردار ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تصنع سے کام نہیں لیا۔ غیر ضروری طور پر تشبیہات واستعارات انڈیلنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر شاعرانہ نہیں بلکہ ان کی سادہ لفظیات میں معنی کی پرکاری نظر آتی ہے۔ ان کے ناول کا ہر اقتباس اپنی جگہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور ناول کی فضا سے مربوط بھی ہے۔

کثرت سے لکھنے والی عورتوں کے یہاں فقط گھریلو معاملات ہوتے ہیں یا پھر عورتوں کی نفسیات، صادقہ نواب سحر کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فقط عورتوں کی نفسیات کے گرد اپنی تخلیقات پیش نہیں کیں۔ فقط گھریلو معاملات یا استحصال کی داستان پیش نہیں کی۔ انھوں نے جہاں دیگر افسانوں میں استحصال کی کہانی سنائی، وہیں تاریخ وتہذیب سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کی فضا میں فقط گھر چہار دیواری نظر نہیں آتی۔'' راج دیو کی امرائی'' میں ایک کائنات ہے اور کئی نسل کے واقعات بھی۔ گویا تاریخی تناظر میں اس ناول کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیوں کہ انھوں نے کم صفحات میں ایک بسیط عہد کو پیش کرنے کی کوشش کی جس میں انھیں کامیابی بھی ملی ہے۔ ایک مختصر ناول میں انھوں نے متعدد نسلوں کی کشمکش پیش کی۔ اس میں پیغام اور فن کاری دونوں کے تناظر میں بہت سی چیزیں ہیں۔

صادقہ نواب سحر نے شاعری بھی کی ہے مگر ان کی نثر شاعرانہ علتوں سے پاک ہے۔ یہ بہت بڑی فن کاری ہے۔ کیوں کہ اگر شاعر نثر کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کی نثر میں اتنی رنگینی آجاتی ہے کہ دوسرے مسائل غائب ہوجاتے ہیں مگر ناول نگار نے زبردست فن کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نثر کو شاعری سے الگ رکھا ہے اور ناول کے لیے ایک قابل ذکر زبان کو استعمال میں لایا۔ جس سے ان کی نثر میں شگفتگی نظر آتی ہے اردو کا ایک بڑا حلقہ ان کے اسلوب کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ گہرے فلسفیانہ رنگ وآہنگ سے بھی انھوں نے اپنی تخلیقات کو پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بین السطور کو سمجھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے۔

مجموعی طور پر اس ناول میں سوانح وتاریخ اور تخلیق وتہذیب کا ادغام نظر آتا ہے۔ تکنیکی اور موضوعاتی سروکار میں ایک جدت ہے۔ کیوں کہ ناول نگار نے تجرباتی سطح پر سوانحی معاملات کو تہذیب میں مدغم کردیا ہے اور اسلوب میں تجربات کے سہارے کئی ایسے رنگ بکھیرنے کی کوشش کی جو معاصر فکشن میں کم نظر آتا ہے۔ صادقہ نواب سحر نے سماجی نفسیات اور طبقاتی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ گویا ان کے اس ناول میں ذاتی نفسیات یا فرد کی نفسیات سے کہیں زیادہ اجتماعی نفسیات کا معاملہ گہرا نظر آتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ صادقہ نواب سحر فقط ایک تخلیق کار نہیں بلکہ سماجیات کی استاد بھی ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے سماجی تناظرات کو فرد واجتماع سے اس طرح سے جوڑا کہ بین السطور میں ہمارا عہد رچا بسا معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول میں موجودہ عہد کی خوشبو بسی ہوئی ہے تو مستقبل میں اس کی دستاویزی حیثیت ہوگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر قسیم اختر
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈی. ایس کالج کٹیہار (بہار)
9470120116

مضامین

صادقہ نواب سحر کے ناول ''جس دن سے'' کا موضوعاتی مطالعہ

تبسم حسن

مضامین

صادقہ نواب سحر ایک ہمہ جہت قلمکار ہیں۔ وہ عصر حاضر میں اردو ادب کے افق پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہیں۔ وہ ممبئی کے ایک علاقے کھپولی سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ ایک اچھی شاعرہ، مترجم، ڈرامہ نگار، تنقید نگار اور ایک ممتاز و معتبر ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانی جاتی ہیں۔ آپ عصر حاضر میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے میں کامیاب نظر آرہی ہیں۔ ان کی بہت ساری تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں لیکن جس تخلیق کی وجہ سے ان کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے وہ ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ، متاشا'' ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کو ادبی دنیا میں کافی سراہا گیا۔ اسی ناول کے سبب ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ یہ ان کا اولین ناول ہے جس کو کئی اداروں نے انعامات سے بھی نوازا۔ اس کا ترجمہ ہندی، تیلگو، انگریزی، پنجابی، کنڑ، مراٹھی وغیرہ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اس ناول میں متاشا نامی ایک لڑکی کی داستان حیات بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے جس میں عورت کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''جس دن سے'' ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ ناول ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جیتیش عرف جیتو ہے جس کے اردگرد اس پورے ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ اس ناول میں جیتو کی روداد حیات پیش کی گئی ہے۔ ناول میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ جو پریوار ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں ان کے بچوں کی نفسیات پر کیا مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اس ناول میں ممبئی کے ایک متوسط طبقے کے پریوار کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں بیانیہ انداز اپنایا گیا ہے اور جیتو کی زبانی پوری کہانی بیان ہوئی ہے۔ وہ ساتویں کلاس میں ہوتا ہے جب اس کی ماں انہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ جیتو باپ کے پاس رہ جاتا ہے اور اسکا بڑا بھائی نکھل ماں کے ساتھ جاتا ہے۔ اس کا باپ پہلے ایک عورت مینکا اور پھر دوسری عورت مینا سے شادی کر لیتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے جیتو کی الجھنیں اور پریشانیاں جنم لیتی ہیں۔ وہ والدین کے جھگڑے اور انکے آپسی تناؤ کی وجہ سے ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی محبت اور شفقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آتی ہیں جن میں ایک شلپی نام کی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ جیتو کا اس کے ساتھ لگاؤ ہونے لگتا ہے کیونکہ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا اور یہ تنہائی اسے اذیت دیتی تھی۔ شاید وہ اسی تنہائی اور اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔ اس تعلق سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے اس سے بڑا لگاؤ ہونے لگا تھا۔ اس کو اپنا ہر احساس بتاتا۔ شاید مجھے کسی کی ضرورت تھی جو میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھائے، رہنمائی کرے، پڑھنے کی تحریک دے''۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیتو کو محبت اور اعتماد کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کسی ایسے انسان کی طلب تھی جو اس کا حوصلہ بڑھائے، اسے صحیح راستے پر گامزن کرے اور اسے پڑھنے کی ترغیب دلائے۔ شلپی یہ سب کام کر سکتی تھی لیکن اس کا ساتھ بھی عارضی ثابت ہوتا ہے۔ وہ قلیل عرصہ کے بعد ہی جیتو سے دور ہو جاتی ہے۔

جیتو کے ماں باپ الگ ہوتے ہی اپنی اپنی کائنات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جیتو کو صحیح راستہ دکھانے والا یا اس کی رہنمائی کرنے والا اس کا کوئی اپنا اس کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ زندگی کی الجھنوں میں الجھتا گیا، اس کا ذہن پراگندہ ہو گیا اور وہ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی اپنی ماں اب اسے ابنارمل

کہتی ہے۔وہ سارے رشتوں سے بے نیاز اور دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔اس کا انسانیت اور دھرم سے بھروسہ ہی اٹھ جاتا ہے۔وہ سب سے بے تعلقی اختیار کرتا ہے اور اسے اکیلے رہنے میں ہی سکون میسر آتا ہے۔اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''کسی دھرم کو مانتے ہوئے ڈرتا ہوں۔خود کو انسان ہی نہیں مانتا۔بننا بھی نہیں چاہتا،انسان مطلبی ہوتے ہیں۔میں بس ایک جیو ہوں۔۔۔۔۔ایک جاندار۔۔۔۔۔!''

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیتو اندر سے کس قدر ٹوٹ چکا ہے۔اس کے پاس کوئی ایسا رشتہ بچا ہی نہیں تھا جس پر وہ اعتماد کرتا۔اس کے سارے رشتے یہاں تک کہ اس کے والدین بھی خودغرض ثابت ہوتے ہیں۔وہ اپنی اولاد کی جانب غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

جیتو زندگی میں قدم قدم پر ناکام ہو جاتا ہے۔امتحان میں بھی بار بار فیل ہو جاتا ہے۔وہ بہت ساری لڑکیوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ لڑکیاں اسے استعمال کرتی ہیں۔جب انھیں اپنا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس سے تعلق منقطع کر دیتی ہیں۔یہ سب چیزیں جیتو کو تکلیف پہنچاتی ہیں۔وہ خود کو بے سہارا محسوس کرتا ہے اور زندگی کی بھول بھلیاں میں ایسے قید ہو جاتا ہے کہ نکلنے کا راستہ ہی نظر نہیں آتا۔وہ اب ہر رشتے کے ساتھ لاتعلقی کا رویہ اپناتا ہے اور دوری اختیار کرتا ہے۔ماں باپ کے لیے اس کے دل میں اب کوئی جگہ نہیں رہتی،وہ ان کو ظالم اور خودغرض گردانتا ہے۔ان کے لیے اس کے دل میں اب عزت نہیں رہتی۔وہ قدرت کو ہی اب اپنی ماں مانتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''مجھے اکثر لگتا ہے ماں،ماں نہیں صرف ذریعہ ہے،دنیا میں لانے کا۔میری ماں مدر نیچر ہے۔میری ماں قدرت ہے۔۔۔۔کیونکہ اسی نے مجھے جینا سکھایا ہے''۔''سلام ماں قدرت!میں جیتیش،اپنی پوری زندگی تم کو اور صرف تم کو وقف کرتا ہوں تم میری زندگی کی کل مالک ہو۔''تمہارے مطابق میری آتما،میری سوچ اور میرے اعمال چلتے ہیں۔۔۔۔تم جو بھی راستہ دکھاؤ گی،اس پر میں ایک اندھے یا نیند میں چلنے والے کی طرح چلوں گا۔تمہارے فیصلے کے سامنے پوری طرح جھکتا ہوں۔۔۔تمہاری خواہش،میرا حکم ہے۔۔۔۔تم سے امید کرتا اور مجھے تم پر یقین ہے۔جانتا ہوں تمہیں میری فکر ہے۔اور میں تمہارا سب سے چہیتا بیٹا ہوں۔ہر ایک چیز کے لیے شکریہ hail mother nature! جے ہو۔۔۔۔جے ہو!۔۔۔تمہارا چہیتا بیٹا جیتو!۔۔۔۔''

جیتو کے دل میں ہمیشہ اس بات کی کسک رہتی ہے کہ کاش اس کے ممی ڈیڈی بھی اس کے ساتھ ہوتے۔وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن اس کے سارے رشتے چاہے وہ خون کے ہوں،دوستی کے ہوں یا محبت کے ایک ایک کر کے خودغرض اور لالچی ثابت ہوتے ہیں۔اس کا کرب انگیز ماضی بار بار اس کے ذہن پر مسلط ہوتا ہے۔جب بھی وہ اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے تو وہ اس میں کھو سا جاتا ہے۔وہ ذہنی الجھن کا اسیر بن جاتا ہے۔وہ ایک بار خودکشی کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن اسے بچایا جاتا ہے۔ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی کی طرف بھی توجہ مرکوز نہیں کر پاتا ہے۔اپنی سب ناکامیوں کے لیے وہ اپنے والدین اور پراگندہ ماضی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔وہ لاء میں داخلہ لیتا ہے لیکن اس میں بھی بار بار فیل ہو جاتا ہے۔دراصل وہ دماغ سے اپنے بھیانک ماضی کو باہر نکال ہی نہیں پاتا جس وجہ سے اسے قدم قدم پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کی ماں جب چودھری کے ساتھ رہنے لگتی ہے تو جیتو کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔وہ سوچتا ہے کہ ممی کیوں ہم دو بھائیوں کو چھوڑ کر چلی گئی،پھر خود ہی کہتا ہے کی شاید انھیں بھی سہارے کی ضرورت تھی۔شاید وہ بھی اکیلے پن کی شکار تھیں۔رفتہ رفتہ جیتو سارے رشتوں سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ایک ایک کر کے وہ ہر کسی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔اب نہ اسے ماں کی ممتا کی ضرورت محسوس

مضامین

ہوتی ہے اور نہ ہی پدرانہ شفقت کی چاہ۔اب وہ ایک سخت اور کٹھور انسان بن جاتا ہے۔وہ بری عادتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔اسے سگریٹ اور شراب کی بھی لت لگ جاتی ہے۔

جیتو بھی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔اسے بھی دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔وہ جس اپنائیت کا متلاشی ہے وہ اسے کہیں بھی حاصل نہیں ہوتی۔جس پیار و محبت کا وہ حق دار ہوتا ہے وہ اسے کبھی اپنے ماں باپ سے نہیں ملتا۔اسی لاڈ پیار کو وہ اپنے دوستوں میں تلاش کرتا ہے۔زندگی کے سفر میں بہت ساری لڑکیاں اس کی ہمسفر بنتی ہیں لیکن وہ سب مفاد پرست ثابت ہوتی ہیں۔انہیں جب ذاتی مفاد حاصل ہوتا ہے تو وہ پھر جیتو کو تنہا چھوڑ دیتی ہیں اور وہ اکیلا ہی اس راہ کا مسافر بن کر رہ جاتا ہے۔اس کی تنہائی اور اکیلا پن اسے جینے کی تحریک دیتے ہیں۔اس کا اکیلا پن اسے مضبوط بنا دیتا ہے۔وہ بھی اب زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے اور خود کفیل بننا چاہتا ہے تا کہ وہ بھی اپنی خواہشات اور ارمانوں کی تکمیل کر سکے۔وہ بھی دوسروں کی طرح خوش حال زندگی بسر کرنے کا متمنی ہے۔وہ اب جینا سیکھ جاتا ہے۔اپنا سہارا خود ہی بنتا ہے۔وہ اپنی گزر بسر اور اپنی روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کال سینٹر میں ملازمت کرتا ہے لیکن وہ ایک جگہ نہیں ٹک پاتا، وہ روز روز کال سینٹر تبدیل کرتا رہتا ہے۔دراصل وہ ذہنی آسودگی کی تلاش میں ہوتا ہے جو اسے کہیں بھی میسر نہیں ہوتی۔اس لیے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا رہتا ہے۔اسکی اپنی ماں اسے ابنارمل کہتی ہے لیکن مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حساس ہے جو اپنے سامنے سارے رشتے ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھتا ہے لیکن لاچاری کی وجہ سے کچھ کر نہیں پاتا، وہ بے بس اور مجبور ہے۔جیتو کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے رشتوں کو بکھرتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن انہیں بچا نہیں پاتا۔یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں طوفان برپا کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ زندگی میں ترقی نہیں کر پاتا لیکن ان سب مصیبتوں کے باوجود بھی وہ خود اپنی زندگی میں کامیاب ہونے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔اس تعلق سے جیتو کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''گھر آتے ہی میں نے ڈائری میں نجانے کیا لکھا۔آنکھ لگ گئی تھی نا! جاگا تو ڈائری کو سینے پر پایا، پتہ نہیں کب لکھ دیا تھا،''زندگی ایک موقع ہے۔اب ثابت کر سکتا ہوں، کچھ بھی سامنے آجائے۔تیار رہوں گا اور جلد ہی ان حالات سے باہر آکر اپنی راہیں ہموار کرلوں گا!''سوچا، جو چیز خود اعتمادی دے رہی ہے وہ ہے حوصلہ۔سمجھداری حوصلے سے آتی ہے۔اسی وجہ سے کہتا ہوں کہ ہر چیز کا سامنا کرنا چاہیے۔اپنے تجربے ہوں، اپنے حوصلے ہوں، اپنے حل ہوں۔اگر کوئی الگ طرح کی بات کرتا ہے تو یقین نہیں کروں گا کیوں کہ اسی طرح زندگی جینا چاہتا ہوں۔کیوں کہ جو دیکھا وہی سچائی ہے، اگر کوئی رائے دیتا ہے اور امکانات بتاتا ہے تو سن تو لوں گا مگر آخر کار میں خود ہی فیصلہ کروں گا۔۔۔کیوں کہ یہ میری زندگی ہے اور کیوں کہ یہی قدرت کا، زمانے کا قانون ہے، جس پر ہر آدمی چلتا ہے۔

کال سینٹر میں ملازمت کرنے کی وجہ سے جیتو کی زندگی میں کچھ سدھار آجاتا ہے۔وہ اب خود کماتا ہے۔اس میں خود اعتمادی آجاتی ہے، اسکا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔وہاں اس کو اچھی تنخواہ مل جاتی ہے۔پہلے وہ غیر ضروری کاموں میں اپنی ساری تنخواہ اڑا دیتا تھا لیکن اب اسے احساس ہوتا ہے کہ فضول خرچی کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے اب وہ پیسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کر کے اب ایک وکیل بن جاتا ہے۔دیر سے ہی صحیح لیکن اتنی ساری پریشانیوں اور الجھنوں کے باوجود وہ خود کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔بے شک اسے بہت جدوجہد کے بعد یہ کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن خود پر اعتماد کر کے اور پڑھائی میں محنت و مشقت کر کے آخر وہ ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔اس طرح سے اسے زندگی میں سکون میسر آجاتا ہے۔

مصنفہ نے اس ناول میں انسانی زندگی کے اہم موضوعات

مضامین

پر خامہ فرسائی کی ہے۔انھوں نے ایک متوسط طبقے کو اس ناول میں پیش کیا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب خاندان ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں تو ان کے بچوں کی نفسیات کس طرح متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ عصر حاضر کا ایک اہم اور توجہ طلب موضوع ہے۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو یہ ناول ایک کثیر الجہات ناول ہے جیسا کہ پروفیسر وسیم بیگم نے بھی اس کے پیش لفظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔اس ناول میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ عصر حاضر کے ان مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔اس ناول میں بچوں کی طرف ماں باپ کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کو دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش میں جٹ جاتے ہیں۔

اس ناول کی دوسری جہت یہ ہے کہ آج کے مادہ پرستی کے دور میں انسان بہت لالچی اور مطلبی بن گیا ہے۔عہد حاضر کے انسان کو جہاں اپنا مطلب اور فائدہ دکھائی دیتا ہے وہاں وہ تعلق بنانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ اس ناول کے کردار مہک کو دکھایا گیا ہے۔ وہ بہت سارے لڑکوں کے ساتھ رشتہ جوڑ لیتی ہے لیکن آخر کار اسی لڑکے سے شادی کرتی ہے جس کے پاس بہت دولت ہوتی ہے۔موجودہ دور کے انسان میں رشتوں کی قدر ہی نہیں رہی ہے وہ بس دولت کو ہی اپنا خدا تصور کرتا ہے۔

اس ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جنسی پیاس بجھانے کی خاطر لوگ ہر روز نئے نئے رشتے بنا لیتے ہیں۔لوگ آئے دن رشتے بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں لوگوں کو جنسی طور پر تسلی وتسکین میسر نہیں ہوتی وہاں سے وہ بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں اور دوسرے رشتے کے متلاشی ہوتے ہیں۔مصنفہ نے اس ناول میں یہ حقیقت بھی ظاہر کی ہے کہ آج کل کے مشینی دور میں انسان کتنا بے حس ہو گیا ہے،اسے رشتوں کی قدر ہی نہیں ہے۔اس ٹیکنالوجی کے دور میں انسان کے آس پاس بہت سارے لوگ موجود ہیں لیکن وہ اس بھیڑ میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا ہے۔انسان کے اردگرد رشتوں کے نام پر بہت سارے لوگ موجود ہیں لیکن اس کو سہارا دینے والا کوئی بھی نہیں۔حالانکہ جیتو کے پاس ماں باپ بھی ہوتے ہیں' دوست اور بھائی بھی ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ اکیلا پن محسوس کرتا ہے۔اسے اکیلے ہی زندگی کی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔عہد حاضر میں انسانی قدروں کا احساس ختم ہو چکا ہے۔جیتو کا کوئی بھی رشتہ مستحکم نہیں ہو پاتا۔وہ ہر وقت خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ناول کی تقریظ میں رتن سنگھ کے الفاظ ملاحظ فرمائیں:

''پیڑ سے سوکھا پتہ' جیسے زمین پر گر کر ادھر ادھر بھٹکتا ہے' اس طرح گھریلو اور باہری زندگی میں وہ بھٹکتا ہے۔اور ہر بھٹکن اس کے دماغ میں پہلے سے موجود لکیروں کو اور الجھا دیتی ہے۔''

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جیتو کی حیثیت بھی ایک سوکھے پتے سے زیادہ نہیں۔جب اس کا خاندان منتشر ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں بدحالی پیدا ہو جاتی ہے۔وہ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔وہ ایک کٹھ پتلی کی مانند بن جاتا ہے جس کی ڈور ہر کوئی جیسے چاہے کھینچتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اسے نچاتا رہتا ہے۔

ناول کا ایک اور پہلو جس پر صادقہ نواب سحر نے اظہار خیال کیا ہے وہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں لوگ محبت کے اصل معنی ہی بھول گئے ہیں۔لوگ محبت کے نام پر کئی سارے لوگوں سے تعلقات جوڑ لیتے ہیں۔دراصل یہ محبت نہیں بلکہ اس کو ہوس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ان میں شرم وحیا ذرّہ برابر بھی نہیں رہی ہے۔یہ نہ صرف نوجوانوں کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ شادی شدہ لوگ بھی اس بھنور میں مبتلا ہو رہے ہیں۔بے شرمی اور بے حیائی عام ہو گئی ہے۔ مصنفہ نے بھی ناول میں ان سب معاملات کو دکھایا ہے۔اس کہانی میں بہت ساری لڑکیاں ایسی دکھائی گئی ہیں جن کے بیک وقت کئی لڑکوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں۔عصر حاضر میں نوجوان لڑکوں

مضامین

اورلڑکیوں کے لیے یہ ایک فیشن بن گیا ہے۔شادی شدہ لوگ بھی ایک شادی کر کے مطمئن نہیں ہوتے۔ان کی ازدواجی زندگی میں بھی انتشار پایا جاتا ہے۔

دور حاضر کے بہت سے مسائل کو مصنفہ نے کامیابی کے ساتھ اس ناول میں بیان کیا ہے۔وہ ان موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتی ہیں۔ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔کہیں کہیں پر مراٹھی کے گیت بھی استعمال ہوئے ہیں کیونکہ خود مصنفہ کا تعلق مہاراشٹر سے ہے اس وجہ سے ان کی علاقائی زبان کا اثر بھی اس ناول میں دکھائی دیتا ہے۔مراٹھی زبان کے استعمال کی وجہ سے قاری کو کہیں کہیں پر ناول کا مطالعہ کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن مصنفہ نے مراٹھی گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے،اس وجہ سے ناول کا مطالعہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔اس سلسلے میں مراٹھی کا ایک گیت ملاحظہ ہو:

''سسارے سسا
دستوس کسا
پیولے پیولے ڈولے
ایولے موٹھے کان
گوت کھاؤں
پُھگتوس تُم''

ترجمہ

''خرگوش ارے اوخرگوش/تو کیسا دکھائی دیتا ہے/پیلی پیلی آنکھیں/
اتنے بڑے کان/ گھاس کھا کر/پھولتا ہے تُم!''

انگریزی کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً ماڈرن،ڈائلیکٹ،ٹیبل،پوسٹ مین،ٹرین ٹکٹ،پرسنل،ایڈمیشن،ٹارچر،ایڈجسٹ،ڈسچارج،آفس،پلان،پراپرٹی،پرابلم،سائڈ،وائف، کمپلینٹ،کوالفکیشن،فیملی اور ڈیورس وغیرہ۔اگرچہ یہ الفاظ راوی کی مناسبت سے استعمال ہوئے ہیں لیکن جہاں اردو میں ان الفاظ کے متبادل موجود ہوں وہاں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ناول اردو زبان میں تحریر کیا گیا ہے اور اردو میں کثرت سے انگریزی کے الفاظ کا استعمال کرنا ایک طرح سے زبان کی خامی سمجھی جائے گی۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مصنفہ نے انگریزی میں بھی ایم۔اے کیا ہے جس وجہ سے انہیں انگریزی میں بھی خوب دسترس حاصل ہے جس کی جھلک ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے میں کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور کہیں پہ تسلسل کی ڈور ٹوٹتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔یقیناً اس ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری محظوظ ہوتا ہے۔

مصنفہ اس ناول میں عہد حاضر کی صحیح عکاسی کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔یہ صرف جیتو کی ہی روداد نہیں ہے بلکہ ان ہزاروں بچوں کی کہانی ہے جن کے خاندان ٹوٹ جاتے ہیں اور ان کی نفسیات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔زندگی ان کے لیے سزا بن جاتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے جیتو کے لیے۔اس تعلق سے رتن سنگھ تقریظ میں یوں رقمطراز ہیں:

''گٹھے ہوئے واقعات،چست جملے،نفسیاتی اعتبار سے حقیقی تجزیہ اور فکری سطح پر مکمل کہانی،صرف جیتو کی داستان ہی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ داستان اس ملک کے ان لاکھوں کروڑوں گھروں کی داستان بن جاتی ہے،جہاں زندگی اس قسم کے بدنما حالات کا شکار ہو کر اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی ہے۔''

مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر نے زندگی کی جن حقیقتوں کو اس ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس میں بجا طور پر کامیاب نظر آتی ہیں۔وہ کہانی بُننے اور قاری کو متاثر کرنے کے گُر سے بخوبی واقف ہیں۔

☆☆☆

تبسم حسن
پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر،شعبۂ اُردو
شعبۂ اُردو،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی،حیدرآباد 500032

راہی فدائی کی نثری تصنیفات کا تنقیدی جائزہ

جی بی عائشہ

تنقید کا بنیادی مطلب کسی فن پارے کا ہمہ گیر جائزہ ہے اور تنقید کا مقصد کسی فن پارے کو نکھارنے اور اس کی چمک کو زیادہ کرنے میں کارآمد ہونا ہے۔ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں جس میں اس کی خوبی اور خامی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ناقد کا کام یہ ہے کہ اس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں پر بھی نظر رکھے اور اصلاحی پہلو اور تعمیری عوامل سے اس کے اچھے اور برے کو ظاہر کرنے کی سعی کرے۔ ان ہی مقاصد میں کامیاب نظر آنے والے رائلسیما کے معتبر ناقدین میں ڈاکٹر فدائی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ گو ان کی تخلیقات دینی، علمی، ادبی اور علاقائی اعتبار سے مملو ہیں اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید، سائنٹفک تنقید، اسلوبیاتی تنقید، تقابلی تنقید جیسے تنقیدی دبستانوں سے آپ نے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تخلیقات کو آراستہ کیا ہے۔

''اکتسابِ نظر'' میں آپ نے قدیم شاعروں ولی ویلوری سے لے کر جدید شاعر و ادیب علیم صبا نویدی تک کے شعراء کی شعری خصوصیات کا تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ ''جوئے شیر'' میں راہی فدائی نے جملہ پندرہ علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کو شامل کر کے اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔ ان کا یہ مجموعہ جنوبی ہند میں فروغ اردو کو نمایاں کرتا ہے بالخصوص مدرسہ باقیات الصالحات سے لے کر محمود شاہد کے افسانوی مجموعے ''ڈھانچہ'' پر مضامین رقم فرما کر اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار فرمایا ہے۔ محمود شاہد کے افسانوں اور اصناف نثر پر گفتگو کی ہے۔

''قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے'' میں موصوف نے علمی، تحقیقی و سائنٹفک تنقید سے کام لیا ہے۔ اسی طرح قدیم مدارس اور ان کے حوالوں سے علم کی افادیت کو بیان کرنے اور موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے میں موصوف کامیاب نظر آتے ہیں۔

تجزیہ (1988ء): مولانا عبدالحمید کی تخلیق کردہ کتاب ''تذکرہ'' کے جواب میں اور ان کی مختلف غلط فہمیوں کو دور کرنے کی سعی میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر راہی فدائی کی تجزیاتی و تقابلی تنقید سے وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔

''تذکرہ'' میں مولانا عبدالحمید صاحب نے حضرت مولانا عبد الوہاب ویلوری قدس سرہ کی عمر کے تعلق سے لکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی کم سنی اور ابتدائی تعلیم پر جو سطور غلط درج کیے ہیں اس کے تضاد میں مولانا راہی فدائی نے دلیل کے ساتھ حضرت اعلیٰ کی عمر کو صحیح اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ مزید لکھا ہے کہ مولانا عبدالحمید نے اعلیٰ حضرت اور دیگر علماء کی تعلیم کے سلسلے کا مذاق اڑایا ہے اور ان کی جائے علم و عرفان کو ہدف طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس بات کے ثبوت اور جملہ تجزیہ کی تحقیقی و تنقیدی وسائل کو پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر راہی فدائی نے تقریباً پینتیس (35) کتب و رسائل کو حواشی کے طور پر پیش کیا ہے بلکہ ہر سطر کو مدلل انداز میں پیش کر کے ایک اچھے ناقد ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لفظ ''حیثیت'' پر موصوف نے مختلف النوع زاویہ نظر سے سمجھایا ہے اور باقیات الصالحات کے تاسیس کی سنہ تاریخ کا ردعمل پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کے اجلاس کی تاریخ کا غلط درج کرنے میں مولانا عبدالحمید کے سطور پر اعتراض کیا ہے اور اپنے تنقیدی شعور سے اس کی صحیح تاریخ کو بیان کرنے کے لیے کئی دلائل کو اپنی تنقیدی زاویہ نظر سے پیش کیا ہے۔

آخر میں موصوف ڈاکٹر راہی فدائی نے اس مدرسہ باقیات الصالحات کے اولین اساتذہ اکرام اور انتخاب اور ان کے کمالِ ہنر مدرسہ کے دفتر خواندگی میں درج کیے گئے تفصیلات سے بھی اس بات کا یعنی تاسیسِ مدرسہ باقیات الصالحات کا جواب پیش کیا گیا ہے۔ مزید مولانا اعلیٰ حضرتؒ کے مسلک پر بھی تفصیلی بحث کرتے ہوئے ہر سوال کا جواب

مضامین

مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔اس سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا ڈاکٹر راہی فدائی نے تقابلی تنقید سے تذکرہ کا جواب تجزیہ میں دیا ہے۔

قلم روفکر(2002ء): ڈاکٹر راہی فدائی کا ایک بہترین تحقیقی وتنقیدی مجموعہ ''قلم روفکر'' ہے جس میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں موصوف کی تنقیدی بصیرت جھلکتی ہے۔ پہلا مضمون ''منشی محمد بادشاہ مولف فرہنگ آنندراج'' میں فرہنگ آنندراج کے مولف کے بدگمان ہونے کا خیال دور کرتے ہوئے فرہنگ کے مختلف اوصاف اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس فرہنگ کے مضمون میں اپنے تاثرات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس فرہنگ کے لفظی خوبیوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

آنندراج لغات اور غیاث اللغات کے لفظی انتخاب اور ان کے لغات کا تقابل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آنندراج اور غیاث دونوں نے اس باب میں ''منتخب'' سے بہت فیض اٹھایا ہے لیکن ''آنندراج'' نے جگہ جگہ چھوٹے بڑے اضافے بھی کیے ہیں۔مثال کے طور پر آنندراج جلد اول یوں ہی بے ارادہ کھولی تو اس میں لفظ ''جائزہ'' پر نظر پڑی۔آنند راج۔ جائزہ۔ بکسر ہمزہ کصاحب۔ ع۔آں کہ از راہ حق میل کند براہ باطل و جور کندہ ستم گار۔ جور و جارۃ و جائرون جمع۔'' آنندراج'' نے یہ لفظ منتخب سے لیا ہے لیکن وہاں اندراج صرف اس قدر ہے:منتخب۔ جائزہ۔ستم کندہ،آں کہ از راہ حق میل کند۔''غیاث'' نے بھی یہ لفظ منتخب سے لیا ہے اور اس کی تعریف یوں کی ہے:

''غیاث۔آن کہ از راہ حق میل کند براہ باطل و جور کنندہ و ستم گار۔''

(قلم روفکر از راہی فدائی،ص۔22,23)

مندرجہ بالا اقتباس سے ڈاکٹر راہی فدائی کے تقابلی تنقید سے استفادے کا رجحان ملتا ہے۔موصوف کا ایک اور مضمون ''رائلسیما میں نعت گوئی۔آزادی کے بعد'' میں موجودہ حالات کی شاعری اور ہماری رفعت فکر پر تنقیدی زاویہ پیش کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے نعت گو شعراء میں لفظوں کی بندش اور معنوی گہرائیوں میں اتر کر شعر کہنے کا مادہ کم ہوگیا ہے اور نعتیہ شاعری میں دلی جذبات و پاکیزہ احساسات کی آئینہ داری کم ہوتی جاتی ہے اور نعتیہ شعراء کی نکتہ رسی،فنی چابکدستی اور کیفیات معنوی سے نعتیہ اشعار خالی ہیں۔اس کی مثال پیش کرتے ہوئے حضرت جلال کڈپوی ، حضرت بلال کڈپوی، حضرت یسیر کرنولی، حضرت فائق نند یالوی، حضرت کاظم جامعی کے اشعار پر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون '' تذکرہ روشنی کے مینار کا ہے'' جس میں ڈاکٹر راہی فدائی نے علیم صبا نویدی کے ادبی سفر کے آغاز پر بحث کیا ہے اور ان کے افسانوں کے جنسی کیفیات اور نجی کیفیات پر تبصرہ کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ کی تخلیق کردہ آزاد غزلوں کا مجموعہ ''ردکفر'' پر تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ مشغلہ تجزیہ برائے تجزیہ تھا۔راقم وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ علیم صاحب واقعتاً آزاد غزل سے خود ہی مطمئن نہیں ہیں۔یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آزاد غزل کے جواز کی بنیادی شرط اس کے مصرعوں کا خش و زائد سے پاک ہوتا ہے تو پھر یہی پابند غزل کے لیے بھی شرط اولین ہے۔ اتنی سی بات تو ہر صاحب وفراست کے لیے ضرور پڑے گی کہ آزاد نظم کی موجودگی میں آزاد غزل کا وجود بے معنی اور لایعنی ہے۔ یہ اس لیے کہ مختصرین نظموں میں مصرعوں والی نظمیں بھی ہیں بلکہ بعض اہل قلم نے ایک مصرعے پر بھی نظم میں اکتفاء کیا ہے اگر چہ کہ وہ اس پر موزوں جملہ کا الزام بھی لگایا ہے۔''

(قلم روفکر از راہی فدائی،ص۔82,83)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر راہی فدائی نے مختلف تنقیدی دبستانوں پر اپنے فن کا سکہ جمایا ہے اور اسے بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔اسی کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''قدیم تمل ناڈو میں عربی، فارسی اور کاوش بدری'' میں موصوف نے کاوش بدری کی تخلیق کردہ کتاب ''قدیم تمل ناڈو میں عربی، فارسی ادبیات کی چار

مضامین

سوسالہ تاریخ'' کے ہر موضوع پر تنقیدی رائے پیش کی ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر راہی فدائی ایک اچھے ناقد ہیں اوران کی تنقیدی فکر سے ان کے تنقیدی رجحانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کتاب کے ابتدائیہ کے ضمن میں ڈاکٹر افضل اقبال کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کی ہے کہ کاوش بدری عربی زبان وادب سے نابلد ہیں اور کاوش بدری کا کوئی عربی مقالہ شائع نہیں ہوا ہے اوراس بات پر بھی اختلاف ہے کہ انھوں نے ارباب فکروفن کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔اس کے علاوہ کاوش بدری کی چند سطروں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کاوش بدری عربی وفارسی زبان سے ناواقف ہیں۔ان کے اس مضمون عربی کتابوں میں فارسی عبارتوں کی بہتات اور فارسی اردو کتابوں میں عربی زبان کے حوالہ جات وحواشی،تشریحات وآیات قرآنی،احادیث وغیرہ کی آمیزش سے لسانی اصول بیک وقت کارفرما نظر آتا ہے۔اچھے خاصے قارئین کو بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کتابوں کو کس خانے میں رکھا جائے۔

ان سطور سے اختلافِ رائے کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن اور احادیث کا ذکر ان کی عربی متن کے حوالے اور ان کی متون کی تشریحات موضوع کی مشابہت کی وجہ سے شامل کیے گئے ہیں۔مزید اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ طلاقت لسانی کا تعلق بین سن ہندی سے ہرگز نہیں ہے جب کہ کاوش بدری نے طلاقت لسانی کو بین سن ہندی سے تعبیر کیا ہے۔مزید اس تعلق سے پرفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے حواشی کے حوالے سے بحث کو جاری رکھا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے دانشوروں کی فہرست کے ساتھ سن وفات مذکور کرنے میں کاوش بدری نے بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔

کاوش بدری کے ایک اور مضمون ''تمل ناڈو میں عربی فارسی اور اردو کے فروغ کے لیے انگریزوں کی خدمات اوراس کے مقابل علماء کی جماعت'' میں کاوش بدری کے مختلف خیالات کا اختلاف کیا ہے۔جو باتیں علمائے دین کے خلاف کاوش بدری نے کہی ہیں ان کا جواب پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کاوش بدری نے چوبیس صاحب تصنیف اہل علم کے اسمائے گرامی اور ان کی تصنیفات کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے مگر اس طویل فہرست میں سوائے حضرت مولانا شیخ صدقتہ اللہؒ اور حضرت حافظ شیخ عبد القادر تیکہؒ کے باقی کسی بھی صاحب قلم کی مادری زبان کاوش کے دعوے کے برخلاف ٹمل نہیں تھی بلکہ دکنی تھی۔کیا شاہ ابوالحسن قربیؒ اور ان کے خانوادے کے دیگر اصحاب قلم مثلاً ذوقیؒ محویؒ اور قطب ویلوریؒ کی مادری زبان ٹمل ہونے کا ثبوت فراہم ہوسکے گا۔نہیں ہرگز نہیں اس لیے کہ یہ بزرگانِ دین بیجاپور سے ہجرت کرکے ویلور پہنچے۔یقیناً ان کی زبان دکنی تھی جس کا ثبوت ان کی تصنیفات میں پایا جاتا ہے۔''

(کتاب مذکور،ص۔103,104)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ڈاکٹر راہی فدائی نے اپنے تنقیدی شعور کو مختلف زاویہ نظر سے استعمال کیا ہے۔مزید کاوش بدری کے غلط مفروضات کا جواب دیا ہے اور کتاب میں شامل جن بزرگانِ دین کی تاریخ وفات اور کتابوں کی تاریخ تصانیف کو غلط ثابت کیا ہے اور مزید اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کتاب میں از ابتداء تا انتہا کس بھی تاریخ کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔الغرض ڈاکٹر راہی فدائی نے اس کتاب میں شامل مختلف مضامین میں اپنی تنقیدی کاوشوں کو بروئے کار لایا ہے۔ان کی انتھک محنت اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے کاوش بدری کے اغلاط کا جواب تحقیقی حقائق کے پیشِ نظر دیا ہے۔

کڈپہ میں اردو (2012ء):

ڈاکٹر راہی فدائی ایک اچھے شاعر،ادیب،محقق،قابل استاد کے علاوہ ایک اچھے تنقید نگار بھی ہیں۔ان کے تنقیدی تصورات ان کے شائع شدہ مختلف تحقیقی وتنقیدی کتابوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔آپ کا ایک تحقیقی وتنقیدی کام ''کڈپہ میں اردو'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے آپ کے تنقیدی دبستانوں اور تنقیدی زاویہ نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کتاب کی پہلی اشاعت سنہ 1992ء میں اور دوسری اشاعت 2012ء میں ہوئی۔یہ موصوف کا شاہکار کارنامہ ہے۔

مضامین

یہ کتاب کڈپہ کے تاریخی ادبی پس منظر کو بیان کرتی ہے۔اس میں موصوف نے کڈپہ کے قدیم شعراء وادباء کی شخصیات اوران کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاثراتی نکاتِ تنقید کا اظہار فرمایا ہے۔موصوف نے اپنے تنقیدی زاویہ نظر سے قدیم شعراء،صوفیا واولیا کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اردو کی ترقی وترویج میں صوفیا واولیائے اکرام کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔آپ اپنے ایک مضمون ''حضرت سید شاہ نوراللہ بادشاہ بخاری قادری نور کڈپوی'' کے شعری لوازمات پر تنقیدی زاویہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت نور کی چوتھی غزل ''ارشادِ نوریہ'' کے سرِ ورق سے پہلے کے صفحے پر لکھی ہوئی آپ کے مذکورہ اشعار سے یہ نکتہ بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری مومنانہ جذبہ صادق کے تحت تخلیق پائی ہے نہ کہ محض شاعرانہ امنگ کے زیر اثر،حضرت نور ہو یا اور کوئی اس قبیل کے صوفی کامل بزرگ شخصیت ان کی تخلیقات کا موضوع کچھ بھی ہو مگر ان کا مقصد تخلیقی اشاعت حق اور ترسیل علم رہا ہے۔اسی لیے بسا اوقات ان کے کلام میں شاعرانہ رجحانات وفنی نکات کی جستجو مایوس کُن ثابت ہوتی ہے۔ایسی صورتحال میں ان تخلیقات کو ادبی تاریخ کے تسلسل کا ایک حلقہ زرّین سمجھ کر مطمئن ہوجانا ہی دیانت داری ہے۔'' کڈپہ میں اردو از راہی فدائی،ص۔85)

مندرجہ بالا اقتباس سے ڈاکٹر راہی فدائی کی تاثراتی وتقابلی تنقید اور فنی زاویے نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے ایک اور مضمون ''جامیٔ دکن حضرت شاہ کمال (دوم) میں موصوف نے ''قصیدہ کمالیہ مع رباعیات کمالیہ اور شرح آں اشعار واقع شدہ اند'' کے عنوان سے شاہ کمال کے قصیدہ کی شرح اور اس کی تشریح کا تنقیدی جائزہ اس طرح پیش کیا ہے:

''شاہ کمال کی اردو نثر کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا اور نہ کسی تذکرہ نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔رباعیات کمالیہ اس تمہید سے یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ نثری رسالہ شاہ کمال کا ہو۔اس لیے کہ ان میں جو باتیں کہی گئی وہی آپ کی رباعیات میں بھی پائی جاتی ہیں اور تصوف کے یہ مسائل کلام کمال کا خاصہ بھی ہیں۔بہ ہر حال قرین قیاس ہے کہ یہ نثر شاہ کمال کی ہو۔واللہ اعلم بالصواب''۔ (کڈپہ میں اردو،ص۔96)

مندرجہ بالا اقتباس سے موصوف کی سائنسی دبستان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔مزید آپ کا تنقیدی شعور آپ کے ایک مضمون ''شاہ قدر عالم'' میں حضرت شاہ قدر عالم کی مثنوی کے تاریخی مطالعے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس دور کے حکمراں اور شعراء کے تاریخی واقعات سے مثنوی سے متعلق مغالطے کو دور کیا ہے۔اس طرح حضرت لامع کڈپوی کی شعری خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت لامع کا کلام عدم عشق ومزاولت کے باوجود کلام میں بالغ النظری اور پختگی کا سرمایہ دکھائی دیتا ہے۔اسی طرح حضرت سالک کی شاعری پر اپنا تنقیدی زاویہ پیش کرتے ہوئے آپ نے ان کی سلاست و روانی سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سالک کا کلام معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے شعراء سے منفرد ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

اپنے ایک مضمون ''حضرت من عرف گنج بخش'' میں حضرت شاہ من عرف گنج بخش کی خلافت میں جو متضاد خیال پایا گیا ہے اس بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ صاحب تذکرہ مجذوب السالکین سید امین چشتی نے شاہ من عرف کو باشاہ حسینی کا خلیفہ قرار دیا ہے جب کہ تذکرہ پہنچ کے مولف نے آپ کو براہِ راست حضرت امین الدین علی اعلیٰؒ کا مرید بتایا ہے جس سے دونوں کی آراء میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے۔راقم الحروف کے نزدیک وضع تضاد کی صورت یہ ممکن ہوسکتی ہے کہ شاہ من عرف ابتداء میں حضرت امین الدین علی اعلیٰؒ کے حلقۂ ارباب میں داخل ہوئے ہوں بعد ان کے فرزند حضرت بابا شاہ حسینی سے وابستہ ہوکر اجازت وخلافت سے سرفراز کیے گئے ہوں۔اس امر کی توثیق شاہ من عرف کے سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت سید حسین حسینی کڈپوی قدس سرہ کے شجرہ بیعت سے ہوتی ہے۔'' (کڈپہ میں اردو از راہی فدائی،ص۔24)

مندرجہ بالا اقتباس اور بحث اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر راہی فدائی نے اپنے تاثراتی زاویہ نظر سے دو متضاد خیالات کا حل تلاش کرتے

مضامین

ہوئے اپنی بات کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں ان کے اس تحقیقی عمل سے ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مدرکات (2013ء)

ڈاکٹر راہی فدائی کی تخلیق کردہ ''مدرکات'' میں مختلف عنوانات پر مضامین ملتے ہیں۔ ان میں چند مضامین پر موصوف نے اپنی تنقیدی بصیرت کی روشنی میں تاثراتی تنقیدی، تقابلی تنقیدی اور سائنٹفک تنقیدی کا سہارا لے کر مختلف موضوعات پر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے ایک مضمون ''کلیات شیخ سعدی کا تحقیقی مطالعہ'' میں ڈاکٹر راہی فدائی نے شیخ سعدی کی شاعری پر بعض ناقدین کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ شیخ سعدیؒ نے تغزل اور عاشقانہ مزاج کے اشعار کہے ہیں

مزید ڈاکٹر راہی فدائی نے شیخ کی تصنیفات کا ذکر شبلی نعمانی کے حوالے سے اپنے خیالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے ڈاکٹر راہی فدائی کی تقابلی تنقید کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ایک اور مضمون ''اردو ادب میں اخلاقیات'' میں اردو نظم اور نثر میں جو اخلاقی اقدار پائے جاتے ہیں اس کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا شکار نامہ اور حقیقت گیت سے لے کر آخری شاعر علامہ باقر آگاہ ویلوری کی طویل تصنیف ''ہشت بہشت'' اخلاق و اقدار اور اصلاحی پہلوؤں کی عکاسی نظر آتی ہے اور مزید اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے جدید شاعری میں بھی اخلاقی اقدار کے پہلو نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے متعدد قلمکاروں کی تخلیقات کو وقار حاصل ہوا ہے۔ اپنے ایک دوسرے مضمون ''اردو ناول کے پچاس سال'' میں ناول کی خصوصیات کو ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے:

''یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ناول کی اس قدر افادیت و اہمیت کے باوجود اس کا سفر فی الحال بوجھل قدموں سے عاری ہے۔ نتیجتاً اس کے شائقین و قارئین کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جانے لگی ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ تیز رفتار زندگی اس کے تقاضوں اور الیکٹرانک میڈیا پر لگاتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مغربی ممالک میں بھی ان ہی اسباب کے ہوتے ہوئے ہمارے ملک کے مقابلے میں امریکہ اور لندن میں نیا ناول خریدنے کے لیے شائقین کی قطار لگی رہتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اہلِ مغرب نے عام زندگی کے تعیش اور اس کی چکاچوند سے خود کو بڑھالیا ہے۔''

(مدرکات از راہی فدائی، ص۔49,50)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر راہی فدائی نے تقابلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک اچھے ناقد ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی علمی و تنظیمی خدمات'' میں موصوف نے ڈاکٹر عبدالحق کی چشمِ بصیرت اور نگاہِ عبرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ جس کی سوچ تک پہنچنے میں صدیاں لگ جاتیں۔ مزید فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے اسلامیہ عربک کالج میں ''طیب کامل کورس'' کو شامل کرنے اور جاری کرنے میں جو کوششیں آپ نے کی ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''اردو سے متضاد تمل شہروں اور علاقوں کے نام'' میں علاقوں کی تاریخ اور ان کے نام کی وجوہات کو شامل کرنے میں جو مواقع فراہم ہوئے ہیں ان کا ذکر کرنے میں موصوف نے جس طرز کو اپنایا ہے اس سے موصوف کی سائنٹفک تنقید کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''مضطر مجاز کی شاعری کا طنزیہ اسلوب'' میں تاثراتی تنقید سے موصوف نے کام لیتے ہوئے طنزیہ شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اسی کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''حضرت ایثار.... بحیثیت استاد اور مترجم'' میں موصوف نے حضرت ایثار کی صلاحیتوں کی بہ خوبی وضاحت کی ہے اور ان پر معتدل رائے پیش کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''حضرت ایثار اپنی بے تکلف گفتگو میں علامہ اقبال کی طرح سادہ اور گھریلو زبان استعمال کرتے ہیں مگر جب قرطاس و قلم کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو آپ پوری طرح سنبھل جاتے ہیں اور کسی عیب جو کی

گرفت میں آنے سے صاف بچ جاتے ہیں۔ یہ بھی آپ کا ایک وصف خاص ہے۔حضرت ایثار اسم بامسمّٰی کہلانے کے علاوہ نوے سال کے پیٹے میں چاق وچوبند نظر آتے ہیں۔'' (مدرکات از راہی فدائی،ص۔98)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے نفسیاتی تنقید کا سہارا لیتے ہوئے نہ صرف حضرت ایثار کی فنی خوبیوں کو بیان کیا ہے بلکہ شخصی طور پر بھی اپنی رائے قائم کرنے میں ثابت قدم رہے ہیں۔ایک اور مضمون ''بصارت سے بصیرت تک ایک تحقیقی کارنامہ'' میں موصوف نے محمد علی اثر کے شعر وسخن اور تنقیدی وتجزیاتی تحریروں پر اپنی گراں قدر رائے پیش کی ہے۔

مصدقات (2015ء): اس کتاب کا پہلا مضمون ''حقیقت نعت'' ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے نعت کی خصوصیات ونعت گوئی کی عظمت کو قرآنی آیتوں سے سمجھاتے ہوئے نعت میں حضور اکرم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کو بیان کیا ہے اور اس کے ذریعے سمجھایا ہے بلکہ اپنی تنقیدی رائے دی ہے اور بعض ناقدین کی آراء پر گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بعض اہلِ علم نعت شریف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک طرفہ یہ کہتے ہیں کہ موثر نعت گو حضور اکرم ﷺ سے انتہائی عقیدت و بے پناہ محبت کے بغیر ممکن نہیں اور دوسری طرف یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ نعت میں ''تیرا اور تم'' جیسے الفاظ کا استعمال بے ادبی وگستاخی ہے۔اگر کوئی شاعر اپنی کہی ہوئی نعتوں میں بضرورت شعری فرط عشق میں ''تم یا تیرا'' سے مخاطب ہوتا ہے تو اسے بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں ہوتے حالاں کہ ایک سچے عاشق کے لیے مروجہ آداب کا لحاظ رکھنا ایسی صورت میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔'' (مصدقات از ڈاکٹر راہی فدائی،ص۔12)

مندرجہ بالا اقتباس سے موصوف کی عملی اور تاثراتی تنقید کے دبستانوں سے وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''غزل کا فلسفہ اور غزل کے رنگ'' پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس میں شامل پندرہ شعراء کے کلام کی خصوصیات اور فنی لوازمات پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی علمی وتنقیدی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے ساتھ ہی غزل کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔''شعری منظر نامہ میں علم عروض کی معنویت'' میں موصوف نے علمی بحث اور لفظ ومعنی اور عروض، بحور پر اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کے اس مضمون کے مطالعے سے موصوف کی سائنٹفک تنقید کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مضمون ''فلک عزیمت کا مہر تاباں'' میں موصوف نے اقطاب ویلوری کی عرفانیت اور اکرامات پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے سائنٹفک تنقیدی دبستانوں سے کام لیا ہے۔''حضرت علی میاں .....دیدہ وشنیدہ'' میں آپ نے تاثراتی تنقید سے کام لیتے ہوئے حضرت علی میاں کی ادبی اور دینی خدمات کی وضاحت کی ہے۔ایک اور مضمون ''دکنی تحقیق اور اولیات محمد علی اثر'' میں محمد علی اثر کی ادبی خدمات اور دکن کی ادبی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے سائنٹفک تنقید سے کام لیا ہے۔اس تنقیدی دبستان سے کام لیتے ہوئے موصوف نے اپنے ایک مضمون ''ڈاکٹر سید عبدالباری اردو کی صالح روایات کے امین'' میں اردو میں غیر مسلم شعراء کی ادبی خدمات اور ادب میں شامل مشترکہ تہذیب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''ڈاکٹر عبدالباری شاعری کی دنیا میں شبنم سبحانی کے نام سے مشہور ہیں۔اس نسبت سے آپ کی شاعری میں اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے حقیقی عناصر کا در آنا قدرتی بات ہے۔آپ نے اپنی غزلوں کے ذریعے محض کسی نظریے کی پیغام رسائی کا کام نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے واقعتاً شاعری کی ہے۔اس ضمن میں آپ کی فکری بلندی، خیال کی تازگی اور تصور کی سچائی اشعار کو روپ دکھا کر جلوہ گر ہوئی ہے۔''

(کتاب مذکور،ص۔116)۔

الغرض موصوف کی تنقیدی خصوصیات ان کے مختلف مضامین میں بکھرے ملتے ہیں۔

☆☆☆

جی بی عائشہ
پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر
ایس وی یونیورسٹی، تروپتی، آندھرا پردیش

مضامین

پریم چند کے افسانوں میں مزاحمتی لَے

میر محمد عابد

ظُلم اور جبر کے خلاف جدوجہد انسانی فطرت ہے۔ انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح اپنی ذات اور دوسروں پر ہورہے ظلم و جبر کے خلاف جد و جہد کرتا ہے۔ اس اختصاص کے ساتھ کہ جانور فقط خود پر ہورہے جبر و تعدی کے خلاف ہی مقاومت کرتے ہیں اور انسان سماج و معاشرے میں ہورہے ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کا شعور رکھتا ہے۔ مزاحمت کسی نظریئے، فکر یا نظام کو قبول کرنے سے انکار پر مبنی فلسفہ ہے۔ روبینہ سہگل اپنی کتاب ''عورت'' اور مزاحمت میں مزاحمت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے یا طریقِ کار کو کہا جا سکتا ہے جو کسی نا انصافی، ظلم، تشدد، بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت کرنا، کسی نا انصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عمل اور متحرک انداز میں کسی ظُلم کا سدِ باب کرنا''۔ (عورت اور مزاحمت، روبینہ سہگل، لاہور پاکستان، ص19)

جبری تسلط، خواہ کسی آمر حکمران کا اپنی رعایا پر ہو یا کسی قوم کا دوسری قوم یا ملک پر، جب ایک خاص حد سے تجاوز کرتا ہے تو سماج کا ذمہ دار دانشور طبقہ ہی اس کے مقابلے کے لیے سامنے آتا ہے۔ اس طبقہ کے زورِ قلم سے مزاحمتی رجحانات تشکیل پاتے ہیں اور نتیجتاً مزاحمتی تحریکیں وجود میں آتی ہیں۔ گویا مزاحمت دراصل افراد یا اقوام کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی آزادی کو سلب کرنے کا منطقی ردِعمل ہے جو انکار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد مزاحمتی ادب کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''ادب تخلیق کرنا بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ کیوں کہ ادیب اپنے گردوپیش سے Conform نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی''۔ (مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، مطبوعہ اکادمی ادبیات پاکستان، ص48)

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں اجتماعی سطح پر غیر یقینی اور نامساعد حالات سے دوچار تھیں۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہندستان، ان زنجیروں سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کی جد وجہد میں ہمہ تن مصروف تھا اور اس کے لیے کسی حد تک سازگار فضا بھی تیار ہوتی جارہی تھی۔ یہی زمانہ ہمارے ادبی منظرنامے پر پریم چند کے ظہور کا زمانہ تھا۔ پریم چند نے اپنا تخلیقی سفر جن افکار و تصورات کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اگرچہ شروع میں ان کا غالب رجحان آدرش واد کی طرف زیادہ مائل تھا لیکن تبدیلیِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ملکی و معاشرتی مسائل، ہندستان کے لوگوں کو درپیش مسائل اور یہاں کی مکمل صورتِ حال ان کے دائرۂ افکار میں آکر ان کی تخلیقات میں جلوہ گر ہونے لگی۔ پریم چند کے عہد میں ہندوستان میں ہر سطح پر جس طرح کی بے چینی اور ناموافق صورتِ حال تھی، نتائج سے بے پروا ہوکر جس طرح ہر طبقہ مزاحمت و مدافعت کی طرف مائل ہورہا تھا' اس کا بہت واضح اور نمایاں عکس ہمیں پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' سے ہی ان کی دلی کیفیت اور ان کے ذہنی کرب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اب ہندستان کے قومی خیالات نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حُب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے ہیں۔۔۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ہمارے

ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں۔۔۔اب ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں''۔(دیباچہ، سوزِ وطن)

پریم چند نے آغاز سے ہی افسانے کی ڈور تھامتے ہوئے مزاحمت و مقاومت کی فضا قائم کی تھی۔اُن کا پہلا ہی قدم انقلابی اُٹھا۔ 1910 سے 1920 کے درمیان پریم چند نے قومی، تاریخی و اصلاحی افسانوں کے ساتھ ساتھ ایسے افسانے بھی لکھے جو معاشرے کو قربانی و جانبازی اور مزاحمت و مقاومت کے لیے آمادہ کریں۔ 1918 میں پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے ہندستانی عوام کی تحریک آزادی کو دبانے کے لیے رولٹ ایکٹ پاس کر دیا۔ اپریل 1919 میں جلیان والا باغ کا دل دوز سانحہ پیش آیا۔اس واقعے سے سارے ملک میں سیاسی سطح پر مزاحمتی اور بیداری کی نئی لہر اُبھر کر سامنے آئی۔ اس سانحہ کی عکاسی پریم چند نے اپنے افسانے ''آشیاں برباد'' میں خوب صورتی سے کی ہے۔اس افسانے میں جہاں جلیا والا باغ کے واقعہ کی مزاحمت کی بازگشت ہے اس کے ساتھ ساتھ کانگریس کے اس ایجی ٹیشن کا ذکر بھی ہے جس میں خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔افسانے کا مرکزی کردار ''مردلا'' وطن کی آزادی کی خاطر اپنا شوہر اور بچہ قربان کر کے سیاسی جدوجہد میں عزم و استقلال کے ساتھ شامل ہوتی ہے۔ درج ذیل اقتباس سے مرکزی کردار کا مزاحمتی رویہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹے نہیں ہیں۔ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھانا تھا کہ تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں''۔ (پریم چند آشیاں برباد، مشمولہ مجموعہ منشی پریم چند (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2005 ص 660)

پریم چند نے اس دور کی تمام سیاسی تحریکوں سے جن کی وجہ سے سامراجی طاقتوں کے خلاف نفرت کے طوفان اُٹھ رہے تھے متاثر ہو کر آزادیِ وطن کی آواز پر لبیک کہا اور یوں ان کے ہاں سیاست کا رنگ اور گہرا ہوتا نظر آتا ہے۔ 1921 سے 1936 کے عہد میں پریم چند کا سیاسی نظریہ اُبھر کر سامنے آتا ہے اس دور میں سیاسی تحریکوں کے جوش و جذبے میں شدت پیدا ہوئی تو پریم چند نے اس کی عکاسی بہت عمدگی سے کی۔

پریم چند کے افسانوں میں اس عہد کی تحریک کا عکس کسی نہ کسی صورت میں نظر آتا ہے۔ابتدا میں وہ گاندھی جی کی عدم تشدد کی تحریک سے متاثر تھے جس کی عکاسی ان کے کئی افسانوں میں ملتی ہے۔ پریم چند گاندھی جی کے اہنسا کے رویے اور تحریکِ عدمِ تعاون سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ہندستان کی جدوجہد آزادی میں شمولیت اختیار کی۔ اس کی واضح مثال ان کے افسانے ''ستیہ گرہ'' اور ''لال فتیہ'' ہیں۔

افسانہ ''لال فتیہ'' کا ہیرو ہری بلاس جو ایک انصاف پسند ڈپٹی مجسٹریٹ ہے اور اسے پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے ساتھ وفاداری کی وجہ سے رائے بہادری کا اعزاز اور ساتھ ہی ایک سرکاری مراسلہ بھی دیا جاتا ہے جس کو پڑھ کر ہری بلاس کے جذبات میں ہیجان برپا ہوتا ہے اور مزاحمت و مدافعت کی وہ چنگاری جو اس کے سینے میں دبی ہوئی تھی شعلہ بن کر بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ سرکار کو جواب لکھتا ہے:

''میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانتداری سے انجام دیا۔لیکن مراسلہ میں جو احکام نافذ کئے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں۔ لہٰذا میں ہندستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا تاخیر اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے''۔(پریم چند'لال فتیہ' ماہنامہ زمانہ، جولائی، 1921، ص 37)

پریم چند یہاں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے ساتھ تعاون قومی غیرت کے خلاف ہے جس کی ہمیں ہر ممکن مذمت

کرنی چاہیے۔ افسانہ ''لال فتیہ'' کے پس منظر میں پریم چند نے درحقیقت اپنی ملازمت سے استعفیٰ کی روداد کو بیان کیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے سرکار کی طرف سے اعزاز کو رد کر کے اپنا استعفیٰ ان لفظوں میں لکھا:

''میرے خیال میں موجودہ حکومت سچائی کے راستے سے پوری طرح ہٹ گئی ہے۔ یہ حکم عوام کے پیدائشی حقوق کو چھیننا اور ان کے قومی جذبات کو قتل عام کرنا چاہتا ہے۔ ایسے بُرے کام میں مدد کرنا اپنی روح، عقل اور قومیت کا خون کرنا ہے۔ اس لیے اب میرے لیے اس حکومت سے عدم تعاون کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے''۔ (امرت رائے، پریم چند قلم کا سپاہی، مترجم حکم چند نیر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1992، ص 311)

پریم چند کے دیگر افسانوی مجموعے ''خاک پروانہ'' (1928) ''خواب و خیال'' (1928) اور ''فردوسِ خیال'' (1929) کے بیشتر افسانے سیاسی و قومی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ اس دور میں پریم چند نے ''ستیہ گرہ''، ''سول نافرمانی''، ''جلسہ جلوس''، ''احتجاجی ریلیاں''، ''بائیکاٹ'' اور دوسری چیزوں کو آزادی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ''ماں''، ''جلوس''، ''بھاڑے کا ٹٹو'' اور ''سوا سیر گیہوں'' وغیرہ اس زمانے کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن میں مصنف کا مزاحمتی و مدافعتی شعور اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

پریم چند کے افسانوی مجموعے ''فردوسِ خیال'' میں شامل افسانہ ''بھاڑے کا ٹٹو'' مزاحمتی رویوں کے حوالے سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے کے تحت الشعور میں سیاسی تحریکوں، خفیہ پولیس کی کارگذاری اور ان سب کے خلاف عوام کے ردِعمل کے بارے میں کھل کر اظہار کیا ہے کہ:

''ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ خفیہ پولیس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی فرضی داستان سُن سُن کر حکام کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کہیں اخباروں کا مُنہ بند کیا جاتا ہے، کہیں رعایا کے لیڈروں کا، خفیہ پولیس نے اپنا اُلّو سیدھی کرنے کے لیے حکام کے اس طرح کان بھرے کہ انہیں ہر آزاد خیال شخص خونی اور قاتل نظر آتا ہے''۔ (پریم چند، بھاڑے ٹٹو، مشمولہ افسانوی مجموعہ فردوسِ خیال، انڈین پریس الٰہ آباد، 1992 ص 159-158)

اسی مجموعے کا ایک اہم افسانہ ''سوا سیر گیہوں'' اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح غریب کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ افسانے میں ساہوکاروں اور مہاجنوں کے مظالم کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں جب شنکر پنڈت جی سے کہتا ہے کہ میں سوا سیر گیہوں کے بدلے ساڑھے پانچ من گیہوں کہاں سے لاؤں؟ تو پنڈت جی مہاراج حقارت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ:

''یہاں نہ دوگے تو بھگوان کے گھر دوگے''۔

شنکر جونہی اس جملے کو سنتا ہے اپنی اندھی عقیدت مندی کی وجہ سے کانپ اُٹھتا ہے اور بے بس و لاچار ہو کر کہتا ہے:

''میں تو دے دوں گا مگر تمھیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا''۔ (سوا سیر گیہوں، پریم چند کے مختصر افسانے)۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔ ''وہاں کا ڈر تمہیں ہوگا مجھے کیوں ہونے لگا، وہاں تو سب اپنے ہی بھائی بند ہیں، رشی مُنی تو برہمن ہی ہیں، دیوتا برہمن ہیں جو کچھ بنے بگڑے گی سنبھال لیں گے''۔ (ایضاً)

شنکر اتنا اناج دینے سے قاصر رہتا ہے اور نتیجتاً پنڈت جی عمر بھر کے لیے اس کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اُسے گلامی سمجھو چاہے مجوری سمجھو، میں اپنے روپئے بھرائے بنا تمھیں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ تم بھاگو گے تو تمہارا لڑکا بھرے گا۔ جب کوئی نہ رہے گا تب کی بات تو دوسری ہے''۔ (ایضاً)

الغرض مذکورہ بالا افسانے میں پریم چند نے ساہوکاروں کے جبر و ظلم اور استحصال کے خلاف اپنی مزاحمتی لے میں شدت پیدا کر دی ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار شنکر کے توسط سے کروڑوں

کرنی چاہیے۔ افسانہ ''لال فتیہ'' کے پس منظر میں پریم چند نے درحقیقت اپنی ملازمت سے استعفیٰ کی روداد کو بیان کیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے سرکار کی طرف سے اعزاز کو رد کر کے اپنا استعفیٰ ان لفظوں میں لکھا:

''میرے خیال میں موجودہ حکومت سچائی کے راستے سے پوری طرح ہٹ گئی ہے۔ یہ حکم عوام کے پیدائشی حقوق کو چھیننا اور ان کے قومی جذبات کو قتل عام کرنا چاہتا ہے۔ ایسے بُرے کام میں مدد کرنا اپنی روح، عقل اور قومیت کا خون کرنا ہے۔ اس لیے اب میرے لیے اس حکومت سے عدم تعاون کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے''۔ (امرت رائے، پریم چند قلم کا سپاہی، مترجم حکم چند نیر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1992، ص 311)

پریم چند کے دیگر افسانوی مجموعے ''خاک پروانہ'' (1928) ''خواب و خیال'' (1928) اور ''فردوسِ خیال'' (1929) کے بیشتر افسانے سیاسی و قومی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ اس دور میں پریم چند نے ''ستیہ گرہ''، ''سول نافرمانی''، ''جلسہ جلوس''، ''احتجاجی ریلیاں''، ''بائیکاٹ'' اور دوسری چیزوں کو آزادی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ''ماں''، ''جلوس''، ''بھاڑے کا ٹٹو'' اور ''سواسیر گیہوں'' وغیرہ اس زمانے کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن میں مصنف کا مزاحمتی و مدافعتی شعور اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

پریم چند کے افسانوی مجموعے ''فردوسِ خیال'' میں شامل افسانہ ''بھاڑے کا ٹٹو'' مزاحمتی رویوں کے حوالے سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے کے تحت الشعور میں سیاسی تحریکوں، خفیہ پولیس کی کارگذاری اور ان سب کے خلاف عوام کے ردِعمل کے بارے میں کھل کر اظہار کیا ہے کہ:

''ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ خفیہ پولیس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی فرضی داستان سُن سُن کر حکام کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کہیں اخباروں کا مُنہ بند کیا جاتا ہے، کہیں رعایا کے لیڈروں کا، خفیہ پولیس نے اپنا اُلّو سیدھی کرنے کے لیے حکام کے اس طرح کان بھرے کہ انہیں ہر آزاد خیال شخص خونی اور قاتل نظر آتا ہے''۔ (پریم چند، بھاڑے ٹٹو، مشمولہ افسانوی مجموعہ فردوسِ خیال، انڈین پریس الٰہ آباد، 1992 ص 159-158)

اسی مجموعے کا ایک اہم افسانہ ''سواسیر گیہوں'' اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح غریب کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ افسانے میں ساہوکاروں اور مہاجنوں کے مظالم کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں جب شنکر پنڈت جی سے کہتا ہے کہ میں سواسیر گیہوں کے بدلے ساڑھے پانچ من گیہوں کہاں سے لاؤں؟ تو پنڈت جی مہاراج حقارت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ:

''یہاں نہ دوگے تو بھگوان کے گھر دوگے''۔

شنکر جونہی اس جملے کو سنتا ہے اپنی اندھی عقیدت مندی کی وجہ سے کانپ اُٹھتا ہے اور بے بس و لاچار ہو کر کہتا ہے:

''میں تو دے دوں گا مگر تمھیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا''۔ (سواسیر گیہوں، پریم چند کے مختصر افسانے)۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔ ''وہاں کا ڈر تمہیں ہوگا مجھے کیوں ہونے لگا، وہاں تو سب اپنے ہی بھائی بند ہیں، رشی مُنی تو برہمن ہی ہیں، دیوتا برہمن ہیں جو کچھ بنے بگڑے گی سنبھال لیں گے''۔ (ایضاً)

شنکر اتنا اناج دینے سے قاصر رہتا ہے اور نتیجتاً پنڈت جی عمر بھر کے لیے اس کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اُسے گلامی سمجھو چاہے مجوری سمجھو، میں اپنے روپے بھرائے بنا تمھیں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ تم بھاگو گے تو تمہارا لڑکا بھرے گا۔ جب کوئی نہ رہے گا تب کی بات تو دوسری ہے''۔ (ایضاً)

الغرض مذکورہ بالا افسانے میں پریم چند نے ساہوکاروں کے جبر و ظلم اور استحصال کے خلاف اپنی مزاحمتی لے میں شدت پیدا کر دی ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار شنکر کے توسط سے کروڑوں

مضامین

مظلوم کسانوں کی حالتِ زار اور دل ہلا دینے والے کوائف بیان کئے گئے ہیں جو برسہا برس سے قرض، بیگار، بھوک اور افلاس کی چکی میں اس طرح پیسے گئے کہ زندگی کی کوئی بھی بہار ان کے نزدیک آنے سے کتراتی ہے۔

پریم چند نے ہریجنوں کی زندگی کے کرب انگیز اور تلخ حقائق بھی مزاحمتی اور احتجاجی پیرائے میں پیش کئے ہیں۔ ہزاروں برس کے سماجی اور اقتصادی ارتقا کے نتیجے میں ہندستان میں جو طبقاتی نظام وجود میں آیا، اس نے یہ انتہائی مظلوم اور ستم رسیدہ طبقہ پیدا کیا جسے اچھوت کہا گیا۔ پریم چند نے اس طبقے کی معاشرتی اور نظریاتی استحصال کی کامیاب تصویر کشی اپنے افسانے ''دودھ کی قیمت'' میں کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گھر میں اتنی جھوٹن بچتی تھی کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے پل سکتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو مٹی کے سکورے اور ایک دھوتی جو سُریش بابو کی اُترن تھی۔ جاڑا، گرمی برسات ہر ایک موسم میں وہ جگہ ایک سی آرام دہ تھی''۔ (دودھ کی قیمت، پریم چند کے مختصر افسانے، ص 102)

لیکن ایک دن منگل اس ''آرام دہ'' جگہ سے بھی ذلت کے ساتھ نکال دیا گیا تو ''ٹامی'' نے اس سے کہا!

''اس طرح کی ذلتیں تو زندگی بھر سہنی ہیں۔ یوں ہمت ہاروگے تو کیسے کام چلے گا۔ مجھے دیکھو نا جب کسی نے ڈنڈا مارا تو چلاّ اُٹھا۔ پھر ذرا دیر بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ ہم دونوں اسی لیے بنے ہیں بھائی''۔ (ایضاً)

پریم چند نے افسانے میں منگل کے سہارے ہریجن کی سماجی و معاشرتی حیثیت کی وضاحت کی ہے جس نے افسانے کے ماحول کو اس کی فضا سے ہم آہنگ کر کے موضوع کو مزید پُر اثر بنا دیا ہے اور ایک ایسا طنزیہ لہجہ اختیار کر لیا ہے جس نے سماجی و معاشرتی جبر کے خلاف مزاحمتی رویہ اختیار کیا ہے۔

پریم چند کے ہاں سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حقائق کا گہرا شعور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کا فن کہیں بھی جامد شے بن کر نہیں رہا۔ بلکہ اس میں بدلتے ہوئے دور کا شعور اور آگاہی موجود ہے۔ ان کے افسانوں نے آزادی کے شیدائیوں کے لہو کو گرمایا اور جابرانہ اور استبدادی قوتوں کے خلاف کھل کر مزاحمت کی۔ پریم چند کے افسانوی مجموعے ''آخری تحفہ''، ''دودھ کی قیمت'' اور ''زادِراہ'' میں شامل بیشتر افسانے اپنے دور کے سیاسی رجحانات کے حامل ہیں۔ افسانہ ''دو بیل'' مشمولہ (آخری تحفہ) ایک علامتی افسانہ ہے جس میں اُس عہد کے ہندستان کی سیاسی زندگی کا منظر نامہ ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے جانوروں کا کردار سماج کا استحصال کرنے والے طبقے کو بے نقاب کرنے کے لیے علامت کو ذریعہ بنایا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار ''موتی اور ہیرا'' دوسری عالمی جنگ سے پہلے کہ ہندستان کے دو بڑے سیاسی گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو ماحول کا ظلم و جبر اور غلامی کے طوق کو اپنی مقدر سمجھ کر خاموش بیٹھا ہے اور یوں بے عملی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس صورتِ حال پر، ان حالات پر نہ صرف احتجاج اور مزاحمت کی آواز بلند کرتا ہے بلکہ اپنی ہمت و حوصلے سے غلامی کے طوق سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تیار کھڑا ہو جاتا ہے۔ چاہے اس میں اس کی جان تک کیوں نہ چلی جائے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

موتی: جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

ہیرا: مجھے اس کی پرواہ نہیں، یوں بھی تو مرنا ہے، ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جائیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے''۔ (پریم چند، دو بیل، مشمولہ پریم چند کے منتخب افسانے، مرتبہ عبداللہ خان، مکتبہ عالیہ لاہور 1997، ص 76-175)

پریم چند اپنی اعلیٰ بصیرت کی بدولت ہی جبر و تشدد اور عدمِ

مضامین

مساوات وطبقاتی کشمکش کے خلاف مزاحمت و مدافعت کرتے رہے۔ وہ زمین داروں اور جاگیرداروں کے ظلم وستم اوران کی لوٹ کھسوٹ اور کسانوں اور غریبوں کی کسمپرسی اور لاچاری دیکھ کر خاموش نہیں رہے بلکہ مسلسل اپنی تخلیقی نگارشات سے ردِعمل کا اظہار کرتے رہے۔احتجاج اور مزاحمت کی صورتیں پریم چند کے کئی افسانوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر ''زادِراہ''، ''نجات''، ''اندھیرا'' اور ''کفن'' میں یہ مزاحمتی لَے خاصی تیز نظر آتی ہے۔افسانہ ''کفن'' احتجاج اور مزاحمت کی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گھیسو، مادھو اور بدھیا تینوں کا وجود اس پورے سماج کے خلاف زبردست مزاحمت کا حکم رکھتا ہے۔ کفن ایک ایسے دور کی کہانی ہے جس میں جاگیردارانہ نظام نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ایک طبقہ دولت مند ہے اور دوسرا طبقہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہے۔ پریم چند نے بڑے اہتمام سے کفن کے تینوں کردار تخلیق کئے ہیں۔ گھیسو اور مادھو کی تن آسانی، خودغرضی، چوری کی عادت، بے حسی، بے مروتی وغیرہ سب اس نظام کے خلاف مزاحمت کی مختلف صورتیں ہیں۔افسانہ کے تمہیدی جملے میں باپ اور بیٹے کو ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے بتایا گیا ہے۔ ''جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے''۔(کفن)

ڈاکٹر محمد حسن کے نظریئے کے مطابق:

''یہ بجھا ہوا الاؤ گویا وہ پورا سماجی نظام ہے جس کے اندر اب کوئی نئی چنگاری کوئی نوائے سینہ تاب باقی نہیں جو اپنے امکانات ختم کر چکا ہے اور شخصیتوں کو کچلنے والا بوجھ بن چکا ہے''۔(پریم چند، زمانہ ذہن اور آرٹ، محمد حسن، ماہنامہ ، آج کل ،پریم چند نمبر اگست 1980 ص 8)

افسانہ نگار اگلے جملے میں بتاتا ہے کہ جاڑوں کی رات ہے۔ فضا سناٹے میں غرق ہے۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا ہے۔ اس جملے کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

''گویا دو افراد اور ان کے سامنے کا یہ الاؤ پوری کائنات سے کٹا ہوا ایک تنہا منظر ہے جس کے سارے رشتے اور سبھی کڑیاں اور رابطے ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے رابطوں اور رشتوں کے منظرنامے میں باپ اور بیٹے ہی کا رشتہ باقی ہے جو انسانی استحصال کے نسلاً بعد نسلٍ چلے آتے ہوئے سلسلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اس بچے تک پھیلتا نظر آتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور جس کی پیدائش ماں کو دردِزہ میں مبتلا کئے ہوئے ہے''۔ (ایضاً)

خلاصۂ کلام یوں تحریر کیا جاسکتا ہے کہ اس پوری کہانی میں اس کے ہر ردِعمل میں مزاحمت کی لَے ایک الگ انداز میں نظر آتی ہے۔ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کہانی میں زیریں لہروں کے ذریعے زبردست مزاحمت کروائی ہے۔اس مختصر تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں سماج کے مختلف طبقوں کی صورت حال پر اس کے نمائندہ کرداروں کے ذریعے ان کے مزاحمتی رویوں کو درشایا ہے۔ سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں، سرمایہ داروں کا استحصال، مہاجنی لوٹ کھسوٹ، مذہب کو اپنی متاع سمجھ کر معصوم عوام کے جذبات سے کھیلنے والے پنڈتوں اور پرہتوں، حکومت کے نمائندوں غرض کسی بھی قسم کی طاقت رکھنے والوں کے خلاف ناطاقتی اور زبردستی کے شکار کرداروں کے ذریعے مزاحمت و مقاومت کی صورتیں پریم چند کے افسانوں میں بہت آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ہمارے ادب میں مزاحمت کی جن آوازوں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے ان میں پریم چند کا نام نمایاں اور سرِفہرست ہے۔

☆☆☆

میر محمد عابد
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد 046 500

مضامین

فرحت سلطانہ

ریاست تلنگانہ میں معذورین کے فلاحی پروگرامس کا جائزہ

کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ انسان کو پانچ قوتیں یعنی حواس خمسہ حاصل ہیں۔ جن میں قوت باصرہ، قوت سماعت، سونگھنے کی قوت، قوت ذائقہ، اور قوت لامسہ شامل ہیں۔ ان حسوں سے زندگی خوشگوار ہے۔ دنیا کی اربوں کی آبادی میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو ان صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ ایسے اشخاص زندہ تو ہوتے ہیں لیکن زندگی کی عام لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوتے اس طرح کی قوتوں سے محروم انسان کو معذور کہا جاتا ہے۔

معذور افراد سماج کا وہ طبقہ ہے جو مختلف رکاوٹوں کی وجہ سے اپنے نجی امور کی انجام دہی کے لئے دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ سماج میں ایک فرد قوم، پڑوسی اور خاندان میں نہ صرف انفرادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ سماجی رشتوں کے پیچیدہ جال میں کئی کرداروں اور حیثیتوں کے ساتھ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت سے بھی رہتا ہے۔ ایک مکمل اور خوشحال زندگی کا تصور، ایک فرد کی صحت مند سماجی ہم آہنگی اور اس کی پرجوش سماجی کارکردگی سے مربوط ہے۔ ایک مایوس کن سماجی زندگی کسی شخص کی زندگی کے دیگر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً میل ملاپ نہ ہونے انفرادی اور سماجی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ جہاں تک معذورین کا معاملہ ہے یہ ایک حقیقت ہیکہ ان میں سے اگر سبھی نہیں لیکن بیشتر احساس کمتری اور مایوس کن سماجی زندگی گذار رہے ہیں۔ افراد خاندان، رشتہ دار، دوست، سماج کے افراد، کام کے مقام پر ساتھیوں اور دیگر کی ہم آہنگی اور غیر ہم آہنگی کی کیفیت اور نوعیت سے ان کے تعلقات، رویہ اور طرز عمل پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ایسے سماج میں خاندان، مختلف طبقات اور حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ معذور افراد کا اعتماد بحال کریں۔ جس کے لئے مختلف تدابیر پر عمل کیا جانا چاہئے۔

اس مضمون میں معذور افراد کی بااختیاری اور خوشحال زندگی کے ضمن میں ریاست تلنگانہ کے اقدامات اور فلاحی پروگرامس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ معذور طبقہ ہر سماج اور مملکت میں اپنے مقام اور حقوق کی جدوجہد میں گھرا ہوا ہے۔ ریاست تلنگانہ میں معذورین کے فلاحی پروگرامس کی عمل آوری کے لئے متحدہ آندھرا پردیش کے دور سے ہی اقدامات کئے جاتے رہے ہیں۔ 2014ء میں علیحدہ ریاست کے طور پر ابھرنے کے بعد ریاست تلنگانہ میں معذور افراد کی اسکیمات اور فلاحی پروگرامس میں مزید ترقی دیکھی جارہی ہے۔

معذورین کی تعریف:

معذوری کی قسم، نوعیت اور شدت کے اختلاف کی رو سے اسکی تشریح کرنا مشکل ہے کہ معذوری کیا ہے؟ یہ سمجھنے کے لئے ان اختلافات کو سمجھنا ضروری ہے۔ عالمی تنظیم صحت (W H O) معذورین کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''معذوری ایک جامع اصطلاح ہے جس میں جسمانی نقص، سرگرمی حدود، رکاوٹ اور شرکت کی پابندی شامل ہے''۔ معذوری کے مختلف اقسام حسب ذیل ہیں:

1۔ جسمانی نقائص (Impairment): خلیاتی یا نفسیاتی بے قاعدگی جس کو علامتی یا شخصی طور پر تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔ جسمانی نقص اعضاء سے جڑا ہوتا ہے۔ مثلاً ہاتھ، پیر وغیرہ

2۔ معذوری (Disability):WHO کی تعریف کے مطابق معذوری جسمانی نقص کی وجہ سے کسی بھی کام کو تکمیل کرنے میں حائل ہونے والی رکاوٹ ہے معذور افراد عام اور معمولی سرگرمیوں کو بآسانی انجام نہیں دے سکتے۔

3۔ اپاہج (Handicapped): اپاہج روزمرہ کے مسائل کو کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں

مضامین

اس اصطلاح کو استعمال کرنا معیوب سمجھا جارہا ہے۔

☆ معذور افراد قانون 1995 (مساوی مواقع، حقوق کا تحفظ اور مکمل شراکت داری) کے مطابق معذور شخص سے مراد ایسا شخص ہے جو کہ 40 فیصد سے زائد معذوری رکھتا ہو۔ جس بات کی تصدیق سرکاری ماہر طب کی جانب سے کی گئی ہو۔

☆ حقوق برائے معذور افراد قانون 2016ء کے مطابق' وہ افراد جو جسمانی معذوری، سوجھ بوجھ کی معذوری،، فہم کی معذوری، ذہنی، رویہ اور ہمہ اقسام کی معذوریوں کے شکار ہیں انہیں بھی شامل کیا گیا۔

معذوری کے اقسام (Types of Disability)

اس قانون کے مطابق جسمانی معذور افراد میں بصارتی معذور، ہاتھ پیر سے معذور، سماعتی اور گویائی سے محروم افراد ہیں جن کی معذوری 40 فیصد سے زائد ہو اور سوجھ بوجھ کی معذوری میں ایسے معذور افراد کو شامل کیا گیا ہے جو اکتسابی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کے عمل میں دشواری محسوس کرتے ہوں۔ دماغی رویہ سے مراد، سوچ، تصور، مزاج، خیال یا یادداشت کا قابل لحاظ خلل ہو جو بڑی حد تک رویہ کو سمجھنے کو متاثر کرتی ہو۔ لیکن یہ ذہنی معذوری میں شامل نہیں ہے۔ ہمہ نوعیتی معذوریاں میں ایسے معذور افراد کو شامل جن کو دو یا دو سے زائد معذوریاں ایک ہی فرد میں ہو مثلاً اکثر بصارتی معذوری کے ساتھ سماعتی معذوری کا ایک ساتھ ہونا اور سماعتی اور گویائی کی معذوری وغیرہ۔ معذورین کی اصطلاح مختلف طریقہ سے کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ معذور افراد کی مختلف اقسام ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حرکت کی معذوری (Locomotor Disability)

حرکت کی معذوری کی تعریف یہ ہے کہ ایک شخص ایک جگہ سے دوسری جگہ خود کو اور اشیاء کو منتقل کرنے اور خصوصی سرگرمیوں روزمرہ زندگی کے امور کی انجام دہی میں دشواری ہاتھ، پیر کی وجہ سے محسوس کرتا ہو ایسے شخص کو حرکیاتی معذور کہا جاتا ہے۔ مثلاً: پولیو سے متاثرہ، قطع اعضاء، ریڑھ کی ہڈی، نرم بافتیں، اعصابی خلل وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

☆ **بصری معذوری (Visual Disability)**

بصری معذوری یا اندھا پن سے مراد ایسا فرد جو مکمل یا جزوی طور پر دیکھنے سے قاصر ہو اور کم نگاہی یا کمزور نگاہی رکھنے والا فرد جو کہ طبی مسلمہ اصلاحی اقدامات سے گزرنے کے باوجود اس مسئلہ سے دوچار ہو ان افراد کو بصری معذور کہا جاتا ہے بعض افراد میں بصری معذوری پیدائشی ہوتی ہے۔

☆ **گویائی وسماعت کی معذوری**

(Dumb & Deaf Disability)

گویائی اور سماعت کی معذوری سے مراد ایسی حالت ہے جس میں افراد بولنے اور آواز سننے کی قابلیت سے محروم ہوتے ہیں۔ کان کے اندرونی یا بیرونی حصہ میں کسی چوٹ لگنے کی وجہ سے قوت سماعت متاثر ہو جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر جو افراد سن نہیں سکتے وہ بول بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ بولنا، سننے کا ردعمل ہوتا ہے۔

☆ **ذہنی معذوری (Mental Disability)**

ذہنی معذورین سے مراد وہ اشخاص ہوتے ہیں جو کہ سماج میں خود سے زندگی گزارنے کے لئے درکار معاون ذہنی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ دماغی/ذہنی معذوری میں دماغی خرابی صحت اور دماغی معذوری شامل ہو سکتے ہیں۔ انسانی نشوونما کے مدارج میں ہونے والی ذہنی افعال میں اگر غیر متوازن حالت دکھائی دے جس کی وجہ سے نشوونما، اکتساب، سماجی ہم آہنگی میں رونما نقائص یا خامی ذہنی معذوری کہلاتی ہے۔ ریاست تلنگانہ میں مختلف قسم کے معذورین کی آبادی 1046822 جن میں مرد معذور 54.01 فیصد اور خواتین معذور 45.98 فیصد ہیں۔

معذورین کے فلاحی اقدامات:

ریاست تلنگانہ میں معذورین کی فلاح و بہبود کے لئے اہم اقدامات کئے جارہے ہیں جن میں تعلیمی، ترغیبی، تربیتی اور سماجی تحفظ

مضامین

کے پروگرام قابل ذکر ہیں۔ تلنگانہ ریاست کے قیام کے بعد جہاں مختلف محکمہ جات، شعبہ جات میں تبدیلی آئی وہیں معذورین کی ترقی کے لئے کارآمد پروگرامس، اسکیمات نئے مرکزی قانون حقوق برائے معذورافراد 2016 کے تحت کئے جارہے ہیں جس کا مقصد معذورافراد کے حقوق کا تحفظ، ترقیاتی اسکیمات اور معذورافراد کے عزت و وقار کو بحال کرنا ہے۔ ریاست تلنگانہ میں معذورین کے اسکیمات، پروگرامس اور قانون کے نفاذ کی بنیادی ذمہ محکمہ برائے معذورین ومعمرین پر ہے۔ اسکے علاوہ دیگر ادارے جیسے ویکالانگولا کوآپریٹیو کارپوریشن، بھی معذورافراد کے لے کام کررہے ہیں۔

محکمہ برائے معذورین اور معمرین:

متحدہ آندھراپردیش وہ پہلی ریاست تھی جہاں 1983ء میں محکمہ فلاح و بہبود معذورین ومعمرین افراد کے لئے قائم کیا گیا۔ علیحدہ ریاست تلنگانہ کے قیام کے بعد ریاست کے لئے علیحدہ محکمہ برائے معذورین اور معمرین کا قیام 2014ء میں عمل میں لایا گیا۔ محکمہ برائے معذورین اور معمرین کا اہم مقصد معذورین کی ترقی کے لئے تعلیم سماجی تحفظ، فلاح و بہبود، سہولتیں اور مواقع فراہم کرنا ہے۔ محکمہ کا ہدف مختلف صلاحیتوں کے معذورافراد کو زندگی سے مقابلہ کرنے اور مہارت حاصل کرنے کے لئے خودمختار اور کارآمد شہری بنانا ہے۔

ریاست تلنگانہ میں محکمہ برائے معذورین ومعمرین کے علاوہ ایک اور ادارہ ویکالونگولا کوپریٹیو کارپوریشن بھی معذورافراد کی بااختیاری اور پروگرامس کی انجام دہی میں معاون رول ادا کررہا ہے۔ وکلانگولا کوآپریٹیو کارپوریشن کے ذریعہ ضرورت مند معذورافراد کو آلات اور اشیاء (AIDS) سربراہ کئے جارہے ہیں۔ تاکہ معذورافراد ان کے سہارے سماج میں اپنا مقام حاصل کرسکیں اور معذورافراد خود کو سماج میں خودمختار تصور کریں۔ اس طرح ریاست تلنگانہ میں ان دو محکمات کی سرگرمیوں کے ذریعہ معذورافراد میں احساس کمتری کو دور کرنے، خود مختار بنانے، تعلیمی، سماجی اور معاشی بااختیاری کے فروغ کے لئے اقدامات مختلف سطحوں پر کئے جارہے ہیں۔

ریاست تلنگانہ میں معذورین کے فلاحی پروگرامس، اسکیمات، الاؤنس اور سبسیڈی کے متعلق تفصیلی جائزہ کچھ اس طرح ہے۔

1۔ **تعلیمی پروگرامس:** تعلیم کے حصول کے مقصد کو ہمارے ملک کے دستور میں بنیادی حقوق میں حق تعلیم RTE کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ ملک کے ہر بچہ کی تعلیم کی ضمانت دی جاسکے۔ اس کے تحت معذورافراد کو تعلیمی طور پر بااختیار بنانے اور پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنے کے لئے مندرجہ ذیل پروگرامس پر چلائے جارہے ہیں۔

رہائشی ادارے): ریاست تلنگانہ میں معذورین کی فلاح و بہبود اور دیکھ بھال کے لئے 10 ہاسٹلس، 10 ہوم برائے معذور اور 5 اقامتی مدارس چلائے جارہے ہیں۔ ان اداروں میں رہنے والے معذورافراد کو کھانا، کپڑوں کے اخراجات علیحدہ طور پر دیے جاتے ہیں اس کے علاوہ بال کٹوانے، سلائی کے اخراجات، اور بستر بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ رہائشی ادارے میں ایک وارڈن اور باورچی ہوتا ہے۔ مخصوص طور پر نابینا معذورین کے لئے ہاسٹل ہوم اور اقامتی مدرسوں میں ایک ریڈر ہوتا ہے جو کہ انہیں روزآنہ دو گھنٹے اخبارات اور دیگر کتابیں پڑھ کر سناتا ہے۔

تعلیمی وظائف: معذورافراد کو تعلیم کی جانب راغب کرنے اور تعلیم تک رسائی کو ممکن بنانے کے لئے تعلیمی وظائف فراہم کئے جاتے ہیں۔ جن میں پری میٹرک، پوسٹ میٹرک، ماقبل میٹرک وظائف برائے ذہنی معذور اور ٹیوشن فیس کی بازادائیگی شامل ہیں۔

پری میٹرک وظائف: ریاستی حکومت ایسے معذور طلباء جن کے والدین کی سالانہ آمدنی 1 لاکھ روپئے سے کم ہو، ماقبل میٹرک وظیفہ اور دیگر الاؤنس فراہم کرتی ہے۔ ہاتھ پیر سے معذور اور بصارتی معذورافراد کو ریڈر الاؤنس بھی دیے جاتے ہیں۔ معذورین کے جماعت کے حساب سے یہ رقومات مختلف ہوتی ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ماہانہ تعلیمی وظیفہ کے علاوہ ماہانہ حمل ونقل کے لئے مالی مدد، آلات کے انتظام کے لئے مالی

مضامین

ماہانہ امداد اور ریڈر کی رقم اول تا پنجم جماعت کے طلباء کو جملہ 170 روپئے ماہانہ دیے جاتے ہیں اسی طرح چھٹویں تا آٹھویں جماعت کے معذور طلباء کے لئے یہ رقم 200 روپئے اور نویں تا دسویں جماعت کے معذور طلباء کو 282 روپئے ماہانہ دیے جاتے ہیں۔ حکومت کے عہدیداروں کی تصدیق کے بعد ان معذور طلباء کو یہ وظائف دیے جاتے ہیں۔

(b) مابعد، پوسٹ میٹرک وظائف: یہ تعلیمی وظائف ایسے معذور طلباء جو کہ انٹرمیڈیٹ، ڈگری، پوسٹ گریجویشن اور پیشہ ورانہ کورسس سے وابستہ ہوں انہیں دی جاتی ہے اور ان معذور طلباء کے والدین کی سالانہ آمدنی 1 لاکھ روپئے سے کم ہو۔ انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کے معذور طلباء کو سالانہ 3250 روپئے اور پوسٹ گریجویشن دیگر پیشہ وارانہ کورسس کے معذور طلباء کو 4420 روپئے سالانہ فراہم کئے جاتے ہیں۔

(c) ٹیوشن فیس کی بازادائیگی: اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ کورسس میں تعلیم حاصل کرنے معذور طلباء کے لئے وظائف کے ساتھ ساتھ ٹیوشن فیس کی باز ادائیگی کی سہولت بھی دستیاب ہے اور اس رقم کی منظوری اداروں میں لاگو فیس کے مطابق دی جاتی ہے۔

(d) ذہنی معذور طلباء کے لئے پری میٹرک تعلیمی وظیفہ:

ذہنی معذور طلباء کی بازآبادکاری اور تعلیمی طور پر با اختیار بنانے کے لئے اس اسکیم کو متعارف کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت ذہنی معذور طلباء کو جو کہ مخصوص اسکولس میں تعلیم حاصل کررہے ہو اور جن کے والدین کی آمدنی سالانہ ایک لاکھ روپئے سے کم ہو سالانہ ایک ہزار روپئے وظیفہ منظور کیا جاتا ہے اس کے علاوہ غیر حکومتی ادارے کے تحت چلائے جانے والے مخصوص اسکولس اور غیر حکومتی ادارے کے تحت چلائے جانے مخصوص اسکولس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہ وظیفہ منظور کیا جاتا ہے۔

2۔ ترغیباتی پروگرامس:

معذور افراد کو ترغیب دینے کے لئے ترغیباتی پروگرامس حکومت تلنگانہ کی جانب سے چلائے جارہے ہیں جس کے مقاصد میں معذورین کو عام افراد سے جوڑنا اور احساس کمتری کو دور کرنا شامل ہیں۔ یہ ترغیباتی پروگرامس کچھ اس طرح ہیں۔

(a) بصارتی معذور طلباء کو بریلی کتابیں:

اول تا دہم جماعتوں میں تعلیم حاصل کرنے والے ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کو بریلی کتابیں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

(b) سفر (حمل ونقل) کی رعایتیں:

ریاستی حکومت کی جانب سے معذور افراد کو سواری کے الاؤنس کے طور پر 650 روپئے ماہانہ دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گاڑیوں کے دیگر اخراجات کے لئے دی جانے والی الاؤنس میں سائیکل 123 اور ماہانہ موٹر سیکل اور لونا وغیرہ کے لئے 700 روپئے ماہانہ دیے جاتے ہیں۔

(b) بستر اور تعلیمی مواد کے لئے مدد :

ہومس اور ہاسٹلس میں رہنے والے معذور طلباء کو کاپیاں Note Books اور بصارتی طلباء کو جو رہائشی مدارس میں رہائش پذیر ہوں انہیں بریلی شیٹ دی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ گدے، بستر، ٹرنک باکس، برتن، کتابیں اور اشیاء جیسے جیومٹری باکس، اسکیل، میاپ، پنسل ربر وغیرہ اور نہم اور دہم کے طلباء کو پڑھنے کے لئے تعلیمی مواد (Study Material) فراہم کیا جاتا ہے۔

3۔ تربیتی پروگرامس

معذور افراد جو کہ سماج میں اپنی زندگی خوشحال گزرانے کے لئے جدوجہد کررہے ہیں ان کے لئے حکومتیں دلچسپی اور مہارت کے لحاظ سے تربیت کے پروگرامس منعقد کرتی ہے۔

تربیتی پروگرامس کی تفصیل کچھ اس طرح ہیں:

(a) موسیقی کے آلات کی سربراہی:

معذور افراد اکثر قدرتی طور پر کچھ نعمتوں سے محروم ہونے کے باوجود وہ حقیقی طور پر زندگی کو ذہن اور روح کے نظر سے محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں موسیقی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے

جذبات اور احساسات کو سماج تک پہنچا سکتے ہیں۔ ریاستی حکومت کی جانب سے ایسے معذور جو کہ حکومت کے موسیقی کالجوں میں موسیقی سیکھ رہے ہوں اور جن کے والدین/سرپرست کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپئے سے کم ہو انہیں ایک ہزار روپئے تک موسیقی کے مختلف آلات مفت فراہم کئے جاتے ہیں۔

(b) اساتذہ کے تربیتی مرکز برائے بصارتی معذورین (حیدرآباد)(TTC Hyderabad)

اساتذہ کے تربیتی مرکز کا قیام 88-1987 میں قومی ادارہ برائے بصارتی معذورین (دہرادون) کے اشتراک اور سرپرستی میں ریاستی حکومت کے تعاون سے کیا گیا۔ اس ادارہ میں ماہر اساتذہ بصارتی معذورین کو تربیت دیتے ہیں۔ ہر سال 120 امیدواروں کو ضروری تربیت دوسال کی معیاد کے لئے اساتذہ کو ترغیبی مرکز بصارتی معذورین حیدرآباد میں دی جاتی ہے۔اس مرکز کے اخراجات اور لکچررس کے الاونس ادارہ برائے بصارتی معذورین NVH دہرادون کے ذمہ ہوتا ہے۔

4۔سماجی تحفظات کے پروگرامس: معذور افراد کو بااختیاری، تعلیم، روزگار اور معیاری زندگی فراہم کرنے میں سماجی تحفظ کے پروگرامس اہم ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

(a) معاشی بازآبادکاری اسکیم

(Economic Rehabilitation Scheme)

معذور افراد کو معاشی طور پر مستحکم اور بااختیار بنانے کے لئے معاشی باز آبادکاری کی اسکیم متعارف کی گئی ہے تاکہ معذور افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہو اور معذور افراد خود سے روزگار کے پراجیکٹس قائم کرسکیں۔ اس طرح معذور افراد اپنی آمدنی کے ذریعہ سماج میں روزمرہ معمولی زندگی گذارنے قابل بن سکتے ہیں۔ معذور افراد کے خودروزگار کے قیام کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے مالی امداد بطور قرض فراہم کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے استفادہ حاصل کرنے معذور افراد کی عمر کی شرط متعین کی گئی ہے اور اس اسکیم کے تحت معذور افراد کو 30,000 روپئے قرض محکمہ APVCC کے ذریعہ فراہم کیا جاتا ہے۔ 30,000 ہزار زائد رقم قرض کو بینکوں سے مربوط کیا جارہا ہے۔

(b) شادی کے لئے ترغیبی انعامات

(Marriage Incentive Awards)

معذورین کو سماجی زندگی میں مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس وجہ سے خاندان، اطراف واکناف کے ماحول سے منسلک نہیں ہو پاتے۔ وہ کیونکہ وہ سماج میں خود کو عام افراد سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ ایک خوشحال زندگی کے حصول میں شادی بھی نہایت اہم قدم ہوتا ہے۔ اس اسکیم میں نارمل عوام سے معذور افراد کو جوڑنے کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے شادی کے لئے ترغیبی انعامات کے پروگرامس پر عمل آوری کی جارہی ہے۔ اور اس اسکیم کے تحت انعام میں پیسوں کے ذریعہ عام افراد کو معذورین سے شادی کے لئے ترغیب دی جاتی ہے۔ اسکیم میں اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے اسکیم سے مستفید ہونے کا شخص پہلے سے شادی شدہ نہ ہو۔ اور نہ ہی اس اسکیم سے پہلے مستفید ہو چکا ہو۔ شادی کے وقت دولہے کی عمر 21 سال اور دلہن کی عمر 18 سال مکمل ہونی چاہئے۔ ریاست تلنگانہ میں ہر نارمل فرد کو جو معذور فرد سے شادی کرتا ہے 50,000 روپئے ترغیبی نقد رقم دی جاتی ہے۔ اس اسکیم سے مستفید ہونے کے لئے لازمی ہے کہ شادی کرنے والے استفادہ کنندگان ریاست تلنگانہ کے باشندے ہوں اور شادی کے ایک سال کے اندر اپنی درخواست آن لائن جمع کروائیں۔

(c) معذور افراد کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کا ماحول

معذورین کو سماج کے تئیں دلچسپی اور رجحان کو فروغ دینے کے لئے ایسا ماحول نہایت ضروری ہے جہاں وہ بلا جھجک اور بغیر کسی رکاوٹ کے زندگی آزادی کے ساتھ گزار سکیں۔ معذور افراد قانون (مساوی مواقع، حقوق کا تحفظ اور مکمل شراکت داری) 1995ء کا اہم

مضامین

مقصد معذورین کے لئے رکاوٹوں سے آزاد ماحول فراہم کرنا ہے۔اس ضمن میں مرکزی حکومت کی جانب سے رہنمایانہ خطوط واضح کئے گئے ہیں۔جس کے مطابق ریاست کے تمام محکمہ جات، کلکٹریٹ، آفس کارپوریشن، بینک، تعلیمی ادارے، بس اسٹیشن، دوا خانے، ریلوے اسٹیشن اور عوامی افادہ بخش عمارتوں میں اس بات کا تیقن دیا جائے کہ معذور افراد کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے ماحول با آسانی ان کی رسائی ہوسکے۔معذور افراد کے لئے ڈھلوان، ramps، مخصوص پارکنگ، لفٹ میں سنائی دینے والے سگنلس، قابل لمس ٹائلس، پلیٹ فارم، اشارے وغیرہ کے ذریعہ الگ الگ قسم کے معذور افراد کے لئے سہولیات دی جائے۔معذور افراد کو عوامی تفریح و سیر وسیاحت اور shopping malls، خریداری کا بازار وغیرہ جس کا مقصد معذور افراد کو سہولت بخش اور بغیر رکاوٹ ماحول فراہم کیا جائے۔

معذورین کے آسرا وظائف:

(Aasra Pensions for Disabled Person)

ریاستی حکومت کی جانب سے ایسے معذور افراد جن کی معذوری 40 فیصد سے زائد ہو بہ لحاظ عمر ماہانہ وظائف دیے جاتے ہیں تا کہ معذورین معاشی طور پر با اختیار محسوس کریں۔ان وظائف کے تحت اگر معذور نابالغ ہونے صورت میں وظیفہ کی ادائیگی اطفال کے والدین/سرپرستوں کو دی جاتی ہے۔معذورین کے وظائف میں وقت اور حالات کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہی ہے۔غیر حکومتی اداروں کے دباؤ پر حکومت نے اس بات پر غور کیا کہ معذور افراد سماج میں دیگر طبقات کی بہ نسبت مختلف مسائل اور مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔

ریاست تلنگانہ کے علیحدہ ہونے کے بعد حکومت نے اپنی سماج تحفظ کی پالیسی کے طور پر وظیفہ آسرا اسکیم کو متعارف کیا گیا تا کہ سماج کے کمزور طبقات، ضعیف، بیوائیں اور معذور افراد کو سماجی تحفظ اور وقار کی زندگی گزارنے اور ان کی یومیہ اقل ترین ضروریات کو پورا کرنے کے لئے معذور افراد کو ماہانہ وظیفہ کو 1500 روپئے کردیا گیا۔ ریاستی حکومت نے مزید غور وفکر کے بعد اس رقم کو بڑھا کر 3016 روپئے ماہانہ کردیا ہے۔ جو کہ کسی بھی معذور فرد کی یومیہ ضروریات کو موجودہ زمانہ کی مہنگائی اور اخراجات برداشت کے لئے کسی حد تک اطمینان بخش ہے۔معذورین کو دیے جانے والے وظائف کا مقصد ان کی معاشی پسماندگی کو دور کرنا ہے۔

اختتامیہ:

ریاست تلنگانہ میں معذور افراد کے فلاح وبہبود کے اسکیمات مرکزی سطح کے قوانین کے مطابق چلائے جارہے ہیں۔اس کے علاوہ 2016 کے قانون حقوق برائے معذورین کے تحت نئے پروگرامس ترتیب دیے جارہے ہیں اور پرانے پروگرامس میں بھی ضروری تبدیلی بھی کی جارہی ہے۔ان پروگرامس میں معذورین کے شراکت کو یقینی بنانے کے لئے وسیع پیمانے پر تشہیر کرے اور شعور بیداری کے مہم چلائے تا کہ معذورین ان تمام پروگرامس سے مستفید ہوتے ہیں۔سماج کے دیگر افراد کے شانہ بہ شانہ زندگی گزار سکیں۔

☆☆☆

فرحت سلطانہ
پی ایچ۔ڈی، ریسرچ اسکالر
شعبہ نظم ونسق عامہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

اقوال زرین

☆ دنیا اس کو یتیم سمجھتی ہے جس کے ماں باپ نہیں ہوتے ہیں، مگر میں اس کو یتیم سمجھتا ہوں جس کے اچھے دوست نہ ہوں۔(حضرت علیؓ)

☆ دنیادار کی صحبت اختیار نہ کرو۔اگر تم تنگ دست ہوجاؤ گے تو یہ تمہیں چھوڑ دے گی اور مالدار ہوجاؤ۔۔۔(حضرت علیؓ)

مادری زبان کی اہمیت اور سماجی ذمہ داری

21 فروری عالمی یوم مادری زبان کے ضمن میں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام اجلاس کی رپورتاژ

ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی

ہر سال 21 فروری کو دنیا بھر میں عالمی یوم مادری زبان منایا جاتا ہے۔ تا کہ مختلف زبانیں بولنے والوں کے مابین لسانی اور ثقافتی شعور اور ہمہ لسانی جذبے کو فروغ دیا جاسکے۔ اقوام متحدہ نے باضابطہ طور پر 2002ء میں ایک قرارداد کی منظوری کے ذریعے عالمی یوم مادری زبان کا دن مقرر کیا تا کہ دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ اس دن کو عالمی یوم مادری زبان بنائے جانے کی ایک تاریخ ہے جب کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ موجودہ بنگلہ دیش کا علاقہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا اور وہاں بنگالی زبان بولنے والوں کی کثرت تھی مغربی پاکستان میں اہل اقتدار نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان بولنے والوں نے اپنی زبان کے تحفظ اور اسے سرکاری درجہ دلانے کے لیے احتجاج کیا اور اس احتجاج کے دوران 21 فروری 1952ء کو پانچ بنگالی نوجوان اپنی زبان کا تحفظ کرتے ہوئے شہید ہوگئے تھے۔ اس واقعے کی یاد میں اقوام متحدہ نے 21 فروری کو عالمی یوم مادری زبان منانے کا اعلان کیا۔ ہندوستان میں بھی اس دن مختلف اداروں کی جانب سے یوم مادری زبان منایا جاتا ہے۔ چنانچہ تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام 21 فروری کو عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے زیر سرپرستی اور ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری کی صدارت میں خواجہ شوق ہال اردو مسکن خلوت حیدرآباد میں ایک اجلاس ''مادری زبان کی اہمیت اور سماجی ذمہ داری'' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے عالمی یوم مادری زبان کے ضمن میں تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد غوث صاحب ڈائرکٹر/سکریٹری نے اس اجلاس میں اپنے زرین خیالات کی پیشکشی کے لیے پروفیسر نسیم الدین فریس صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پروفیسر فاطمہ پروین صاحبہ سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر عبدالسمیع صدیقی ڈائرکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی مانو حیدرآباد پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر عابد معز ممتاز ہیومرسٹ اور جناب فاروق طاہر ماہر تعلیم اور استاد اردو کو مدعو کیا۔ ان ماہرین کے علاوہ یونیورسٹی و کالج کے اساتذہ اور محبان اردو کی ایک کثیر تعداد نے اس اجلاس میں شرکت کے ساتھ اردو زبان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت ممتاز شاعر و معاون مدیر روشن ستارے جناب سردار سلیم صاحب نے کی اور دوران گفتگو اردو زبان سے متعلق مقبول عام اشعار پیش کیے۔ سردار سلیم صاحب نے اردو کے حوالے سے یہ شعر پیش کیا کہ ''چاند چہرے مجھے اچھے تو بہت لگتے ہیں۔۔ عشق میں اس سے کروں گا جسے اردو آئے''۔ تقریب کے آغاز میں جناب فاروق طاہر نے عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر کہا کہ انسان اپنی تمام تر ضروریات، تکالیف، رنج اور خوشی کا اظہار اپنی زبان میں ہی کرتا ہے انہوں نے کہا کہ زبان ایک وسیلہء اظہار ہے۔ ہمارے شعراء و ادیب چکبست، فراق اور پریم چند وغیرہ نے دیگر زبان سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو میں تخلیقات پیش کیں۔ اردو شعر و ادب کے علاوہ علوم کی زبان ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو میں معلوماتی ادب پیش ہوتا رہے۔ انہوں نے کہا کہ بہ حیثیت مادری زبان اردو کو موثر اور معتبر بنانے کے لئے ہمیں اپنی نوجوان نسل کو اردو سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر عبدالسمیع صدیقی ڈائرکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی مانو حیدرآباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور ہم اپنی مادری زبان کا جشن منا رہے ہیں اردو علاقائی زبان کے علاوہ ملک کی قومی زبان ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی 2020 کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں بھی بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی بات کہی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اداروں اور تحریکوں کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کام کیا جائے۔ اردو کے ساتھ ہم ادب اور تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ جب کہ ہمیں اردو کے حوالے سے اپنی سماجی ذمہ داری کو بھی محسوس کرنا چاہئے۔ پروفیسر عبدالسمیع صدیقی نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ اردو ترجمے کے ضمن میں روزگار کے مواقع سے نوجوانوں کو واقف کرایا جائے۔ حیدرآباد جہاں I.T.Hub ہے تو وہیں تہذیبی hub بھی ہے، اور یہاں ایک Multilingual معاشرہ بھی ہے، ایسے میں ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت کریں تو اس کے ذریعہ

مضامین

تہذیب کی بھی حفاظت ہوگی۔اردو عالمی بستیوں میں مقبول ہے ۔اردو خطرے میں نہیں ہے۔اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑا جائے۔صارفیت والے سماج میں اگر ہم فروغ اردو کا کوئی کام نہ کریں تو کوئی دوسرے یہ کام کریں گے۔اہل حیدرآباد اہل اردو بھی ہیں اور ان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ فروغ اردو کے لیے آگے آئیں اور خوشی کی بات ہے کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اردو زبان کے فروغ کے لیے فعال ہے۔ڈاکٹر عابد معز ممتاز ہیومرسٹ نے اپنے خطاب میں کہا کہ مادری زبان عطیہ خداوندی ہوتی ہے اردو زبان کے ساتھ ہونے والی بے رغبتی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آج اردو مادری زبان کم اور جدی زبان زیادہ ہوتی جارہی ہے اور ہمارے اسلاف ہی اردو سے واقف نظر آتے ہیں۔آج قومی منظرنامے میں ملکی زبان، علاقائی زبان اور انگریزی پڑھنا سب کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اردو زبان کی حفاظت میں لاپرواہی برت رہے ہیں ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔انہوں نے تجویز پیش کی کہ اردو کو تعلیمی نظام کا حصہ بنایا جائے اور ایک مضمون اردو رکھا جائے۔اردو کے فروغ کے لیے مالی وسائل کا انتظام کیا جائے اور حکومتی سرپرستی کی کوشش کی جائے۔پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کہا کہ بچہ ماں کا دودھ نہیں پیتا بلکہ ساری تہذیب سیکھ کر آتا ہے جب تک مائیں اردو سے واقف ہوں گی اردو کی تہذیب بھی نئی نسلوں میں منتقل ہوگی۔انہوں نے کہا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم ایک ایسے بادشاہ کے ساتھ رہے جس نے اردو ذریعے تعلیم کے ساتھ جامعہ عثمانیہ قائم کرکے اردو میں علوم وفنون کی تعلیم دی۔ ملک کی پہلی اردو جامعہ اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والوں کو اردو سکھائی جائے۔ انہوں نے کہا کہ آج ہمارے گھروں سے اردو رخصت ہوگئی ہے، ہمارے بچوں کو باورچی خانہ، دیوان خانہ اور روزمرہ چیزوں کے اردو نام نہیں معلوم اس کے برخلاف بچے آج ڈرائنگ روم، کچن اور میاٹ معلوم ہیں۔ہماری تہذیب رخصت ہوچکی ہے رشتوں کو آنٹی اور انکل تک محدود کردیا گیا ہے جب کہ اردو زبان میں رشتوں کا مکمل ذکر ملتا ہے۔انہوں نے کہا کہ آج ماؤں کو چاہیے کہ وہ اولاد کو ان کی مادری زبان اخلاق وتہذیب کا درس دیں انہوں نے نپولین کا قول دہرایا جس میں اس نے کہا تھا کہ "تم بہترین مائیں دو میں تم کو بہترین قوم دوں گا"۔انہوں نے اردو کی ترقی کی توقع کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ اردو زندہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج اردو دلت گھروں میں داخل ہوگئی ہے وہ اس طرح کہ ابھی حال ہی میں چار دلت طلبہ نے یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ۔ڈی کی تکمیل کی ہے۔انہوں نے کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور ان سے اردو میں بات کریں۔ پروفیسر نسیم الدین فریس صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ماہرین تعلیم کے مطابق ایک آدمی کی ایک سے زیادہ مادری زبان ہوسکتی ہے۔تہذیب وثقافت بدلتے رہتے ہیں اس لیے زبان میں بھی تبدیلیاں لازمی ہیں۔ماہرین تعلیم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو کیوں کہ ہر بچہ اپنی مادری زبان میں ہی سوچتا ہے۔انہوں نے مادری زبان سے بے رغبتی سے خبردار کیا اور کہا کہ ہمیں خواب غفلت سے بیدار ہونے کی ضرورت ہے اور اردو زبان کی بقا کے لے باضابطہ مہم چلائی جائے اور اسکولس کالجس اور یونیورسٹیز کے انتظامیہ سے اردو زبان سکھانے نمائندگی کی جانی چاہئے۔پروفیسر فاطمہ پروین صاحبہ سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ زبان انسان کی ایسی خصوصیت ہے جو اسے حیوان ناطق بناتی ہے اور جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے وقتوں میں گھر اور مدرسہ کا ماحول ایک ہوتا تھا، والدین بچوں سے اسکول میں پڑھائے گئے مضامین کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ اس وقت کے اساتذہ طلبہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو منظر عام پر لاتے، انہیں نکھارتے، ایسا صحت مند ماحول آج نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ آج سے سو سال قبل علامہ اقبال نے کہا تھا مغرب کی طرف سے ایک خون کی لہر مشرق کی طرف آرہی ہے اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔لیکن ہم نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت سے لاپرواہی برتی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے حیدرآباد میں اردو ذریعہ تعلیم کی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے باوجود ناگری رسم الخط کو رواج دے کر اردو کے خلاف سازش کی۔ انہوں نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکولی سطح پر جہاں انگریزی اسکولس قائم ہیں ان اسکولوں میں اردو ٹیچر فراہم کئے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ دانشوران و

مضامین

اساتذہ اردو کا تعاون حاصل کیا جائے تو ہوسکتا ہے حالات بدل جائیں اور پھر مادری زبان کی حفاظت ہوسکے گی۔ ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے اس اجلاس سے اپنے خطاب میں تمام شرکائے اجلاس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آج عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر منعقدہ اس اجلاس میں مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام اس سال ناموافق حالات کے باوجود اردو سے ناواقف افراد کے لیے مختصر مدتی اردو دانی کورس کا اہتمام کیا گیا۔ اسی طرح مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے تعاون سے اردو اساتذہ کے لیے پانچ روزہ آن لائن تربیتی پروگرام کا انعقاد عمل میں لایا گیا اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ گرائجویشن کے طلبہ کے لیے سیاسیات، معاشیات اور تاریخ کی سال اول دوم اور سوم کی جملہ 9 کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی گئی اور اس کے علاوہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے مقصد سے مختلف اسکیمات پر عمل آوری ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اردو اکیڈیمی وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر سمینارس اور ثقافتی پروگرامس بھی منعقد کرتی ہے اور آج کا یہ اجلاس بھی اکیڈیمی کے پروگرامس کا ایک حصہ ہے۔ ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے اپنے خطاب میں اس عزم کا اظہار کیا کہ اردو انجمنوں اور تنظیموں کے تعاون سے اردو کے فروغ، تحفظ، ترقی و ترویج کی کوششوں میں مزید تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اجلاس کے اختتام پر تاثرات کے لیے ڈاکٹر عزیز سہیل اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کو مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر عزیز سہیل نے کہا کہ انفرادی اور اداروں کی کوشش کے علاوہ تلنگانہ اور ملکی سطح پر سرکاری سرپرستی کے حصول کے لیے ہمیں ایک پریشر گروپ بھی تشکیل دینا چاہئے۔ اور حکومت سے فروغ اردو کے لیے زیادہ سے زیادہ بجٹ طلب کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے کہا کہ زبان ایک زندہ رہنے والی شئے ہے اور جب تک اسے برتا جائے زبان زندہ رہے گی انہوں نے مختلف اداروں کے لیے درست اردو سائن بورڈز پیش کرنے خدمات کی ضرورت اور غیر اردو دانوں کو رضا کارانہ طور پر اردو سکھانے تجاویز پیش کیں اور کہا کہ ڈاکٹر غوث صاحب کے زیر نگرانی تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام فروغ اردو کے اختراعی پروگرام کامیابی سے عمل میں لائے جارہے ہیں۔ عالمی یوم مادری زبان کے ضمن میں منعقدہ اس کامیاب اجلاس کے آخر میں جناب محمد ارشد مبین زبیری انچارج ماہنامہ قومی زبان نے صدر نشین صاحب اُردو اکیڈیمی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا کی اور ڈائرکٹر/سکریٹری ڈاکٹر محمد غوث، تمام مہمان مقررین، حاضرین اجلاس، اردو اکیڈیمی کے عہدیداران و ارکان عملہ، اردو مسکن کے نگران و عملہ کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس میں جناب سلیم فاروقی صاحب اردو اکیڈیمی جدہ، جناب تمیز الدین صاحب، دانشوران، اساتذہ، شعراء کرام، محبان اردو، عہدیداران و ارکان عملہ اردو اکیڈیمی جناب عطا اللہ خان، شیخ اسمٰعیل، ڈاکٹر احتشام الدین خرم، احمد بن اسحاق، جنید اللہ بیگ، اطہر خان، عبدالذاکر، یوسف خان، انور علی خان، رجب علی پاشا، محمد اسمٰعیل جاوید، محمد رفیع، محمد معین، معین خان اور دیگر ارکان عملہ موجود تھے۔ اس اجلاس کو جناب ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے فیس بک کے ذریعے ساری دنیا میں براہ راست پیش کیا۔ ایک ہفتہ بعد اسی خوجہ شوق ہال میں یوم سائنس کے ساتھ عالمی یوم مادری زبان کا اختتامی اجلاس بھی منعقد کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ اردو اکیڈیمی تلنگانہ کے زیر اہتمام فروغ اردو اسکیمات کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

مضامین

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروارہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

اُردو ہماری مادری زبان ہے، اس کا تحفظ کیجئے۔
اُردو خود بھی سیکھئے، اپنی نئی نسل کو بھی سکھائیے۔

ماں کا دل

عابدہ محبوب
حیدرآباد

افسانے

چچا جان ۔۔۔۔ چچا جان ۔۔۔۔ میرا اکلوتا چھ سالہ بھتیجا سجو بے تحاشا دوڑتا ہوا آکر میری پیٹھ کے پیچھے چھپ گیا۔

''ار۔۔۔۔۔ارے۔۔۔۔کیا ہوا؟ میں کتاب چھوڑ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ چچا جان۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔بچایئے۔۔۔۔بچایئے !امی آرہی ہیں !اس نے التجاءً مجھ سے کہا اور لپک کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' دروازے میں بھابی کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں موٹی سی ایندھن کی لکڑی لئے وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھیں۔غصہ میں ان کا چہرہ اور بھی سرخ ہو چلا تھا۔

بھابی اور سجو کی اس'' بھاگ دوڑ'' سے میں اچھی طرح واقف تھا۔آئے دن گھر میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا۔شاذ و نادر ہی کوئی دن ایسا جاتا جب کہ سجو بھابی کو ستاتا نہ ہو یا محلّہ سے سجو کی شرار توں کے بارے میں شکایتیں نہ آتی ہوں ۔اور بھابی لکڑی لئے اس کے پیچھے نہ دوڑی ہوں ۔مگر ایک بات بڑے کمال کی تھی سجو پر بھابی کا نشانہ ہمیشہ چوک جاتا۔ پتہ نہیں یہ جان بوجھ کر ہوتا تھا یا غلطی سے میں کبھی نہ جان سکا۔ مجھے تو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ جب جب سجو کوئی شرارت کرتا' بھابی اینٹ یا پتھر یا لکڑی یا بیلن' جو ہاتھ لگ جاتا' لے کر دوڑ پڑتیں اور کچھ ایسا'' تاک'' کر مارتیں کہ لکڑی یا پتھر ایک طرف جاتا اور سجو دوسری طرف کو۔ظاہر ہے اس وقت کی یہ'' بھاگم بھاگ'' میرے لئے نئی نہ تھی۔ میں نے حسب عادت مسکرا کر بھابی سے پوچھا ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ بھابی؟''

''تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ''۔ بھابی نے میرا سوال سنا ان سنا کر دیا۔

''اگر نہیں ہٹا تو کیا مجھے پیٹ دیں گی آپ؟''

''اسے چھوڑ دو ظفر''۔اس بار بھی بھابی نے جواب کی بجائے حکم دیا۔

''میں نے اسے پکڑ تھوڑی رکھا ہے بھابی؟ دیکھئے۔آپ ہی دیکھئے''۔میں نے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'جن سے ابھی تک وہ چمٹا ہوا تھا۔''میں نے اسے پکڑ رکھا ہے یا اس نے مجھے جکڑ رکھا ہے؟ دیکھئے' میں ہل تک نہیں سکتا''۔

''سجو! سامنے آ''۔ بھابی نے براہ راست سجو کو حکم دیا۔

''اوں۔۔۔اوں ۔۔۔ چچا جان' '' سجو نے مچل کر مجھے پکارا۔

''میں کہتی ہوں سجو' سیدھی طرح سامنے آجا۔۔۔۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا''۔ بھابی بدستور غصہ میں تھیں۔

''آپ مجھے ماریں گی۔۔۔۔اوں۔۔۔اوں''۔سجو رونے کی تیاری کرنے لگا۔

''ماروں گی؟ آج مار مار کر تجھے مردہ کردوں گی۔دیکھنا!''۔سجو باقاعدہ بین بجانے لگا۔

''ڈھونگی کہیں کا۔ایسے رو رہا ہے جیسے کسی نے مارا ہی ہو۔مانتا ہی نہیں۔ادھر آ''۔

بھابی کے اس حکم پر مجھے ہنسی آگئی ۔آپ ہی سوچئے ایک ماں ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے غصہ سے لال پیلی کھڑی ہو اور اپنے بچے کو حکم دے رہی ہو کہ وہ ''ہنسی خوشی'' اس سونٹے کے زیر سایہ آجائے تو بچہ مانے گا؟ سجو بھی اڑ گیا۔

''نہیں! میں نہیں آؤں گا''۔

''نہیں آئے گا ؟ ''بھابی دندناتی آگے بڑھیں اور سجو چلانے لگا۔

''چچا جان۔۔۔چچا جان۔۔۔'' میں نے آگے بڑھ کر بھابی کا وار روک دیا۔

''چھوڑو ظفر!'' بھابی چڑ سی گئیں۔

''ابھی چھوڑتا ہوں بھابی۔ میں دراصل دیکھ رہا تھا کہ۔ ارے! اتنی پتلی سی لکڑی لی ہے آپ نے۔ذرا تو موٹی لیتیں!''۔

چلّانے لگا۔

''چچا جان۔۔۔ چچا جان۔۔۔'' میں نے آگے بڑھ کر بھابی کا وار روک دیا۔

''چھوڑو ظفر!'' بھابی چڑ سی گئیں۔

''ابھی چھوڑتا ہوں بھابی۔ میں دراصل دیکھ رہا تھا کہ اتنی پتلی سی لکڑی لی ہے آپ نے۔ ذرا تو موٹی لیتیں!''۔

''چھوڑو ظفر۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے''۔ وہ لکڑی چھڑانے کی فکر میں تھیں۔

''کون مسخرا مذاق کر رہا ہے؟'' گو میں چارہ رہا تھا کہ بھابی کا موڈ بدل دوں۔

''مجھے آج بہت غصہ آرہا ہے۔ تم ہٹ جاؤ ظفر''۔ بھابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

''ہاں ہاں! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کا غصہ کتنا خطرناک ہوتا ہے! اسی لئے تو روک رہا ہوں!''۔

''نہیں ظفر آج دیکھ لینا کیسی خبر لیتی ہوں اس نالائق کی۔ روز روز کی دل لگی سمجھ لی ہے۔ آج مارے بنا میں چھوڑوں گی نہیں۔ مجھے چین نہیں آئے گا''۔ بھابی کے تیور بری طرح بدلے ہوئے تھے۔

''آخر ہوا کیا؟ سجو نے کیا کیا؟''

''ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے کرنے کو؟ شرارتیں ایک طرف رہیں، محلے والوں کی شکایتیں الگ۔ یہ تو ڑ۔۔۔ وہ پھوڑ! میں نے بچہ سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کیا سمجھایا بجھایا۔ مگر نالائق نے اب بدمعاشی پر کمر باندھ لی ہے''۔

''بدمعاشی پر؟ کیا سگریٹ بیڑی پینے لگا ہے؟''

''جی نہیں۔۔۔ چور بن گیا ہے پکا چور! آج تیسری بار میرے پان دان میں سے پھر اس نے پیسے نکالے ہیں۔ بغیر مجھ سے کہے پوچھے! میں نے پوچھا تو جھوٹا صاف مکر گیا۔ حالانکہ اماں نے خود دیکھا کہ''۔

''کیوں سجو؟'' میں نے بھابی کی بات کاٹ کر مخاطب کیا ''پھر تم نے ایسی حرکت کی؟''

''غلطی ہوگئی چچا جان آئندہ نہیں کروں گا۔ توبہ۔ توبہ!''۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنے گالوں کو پیٹنے لگا۔

''پہلے دو بار بھی توبہ ہو چکی ہے۔ مگر پھر آج''۔ بھابی اور بھڑک اٹھیں۔

''لاتوں کے بھوت باتوں سے تھوڑی مانتے ہیں۔ کچھ یادگار نصیحت ملے تو آئندہ غلطی نہیں کرے گا''۔

''خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ بھابی اب کے میرا ذمہ۔ میں سمجھا دوں گا سجو کو۔ اگر آئندہ اس نے ایسی حرکت کی تو میں خود اسے پکڑ کر آپ کو دوں گا۔ وعدہ!۔ بس؟''

میں نے سمجھا تھا بھابی ہمیشہ کی طرح لکڑی پھینک اپنی مسکراہٹ کو سجو سے چھپاتی چل دیں گی۔ مگر ان کے گرجنے سے میں بھی ذرا ڈر رہی گیا۔

''تم کیا سمجھاؤ گے جی؟ اب تک سمجھانے کا کیا نتیجہ نکلا؟ خوب! دادی بھی وارے نیارے کرتی ہیں، باپ بھی لاڈ کرتے ہیں، چچا الگ پشت پر رہتے ہیں۔ بگڑے گا نہیں تو کیا ہوگا۔ اور نام بدنام ہوتا ہے ماں کا۔ ایک ہونے کی وجہ سے بے جا لاڈ پیار نے بگاڑ دیا۔ اونھ تمہارے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھاؤں گی آج''۔

''مار سے بگڑ جائے گا بھابی! بچہ ہے، ایک سے دو بار بولنا ہی پڑتا ہے۔ خواہ مخواہ جاہلوں کی طرح غصہ۔۔۔''

''ہاں ہاں۔۔۔ میں جاہل ہوں۔ مجھے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ بس تم ہٹ جاؤ''۔ وہ خواہ مخواہ لڑنے کے موڈ میں آگئیں۔

''میں ہٹ جاتا ہوں بھابی۔ مگر لکڑی تو دیکھئے کہیں بے

افسانے

جا مار پڑ گئی تو آپ خود ہی روئیں گی بیٹھ کر''۔

''روئے میری جوتی ! کچھ ہو جائے مر جائے مجھے کیا ؟''میں نے بھابی کو آج تک اس قدر غصے میں نہ دیکھا تھا۔''ایسی نالائق اولاد کا مر جانا ہی اچھا ہے۔عزت کی زندگی کے لئے میں اسے جان سے مار ڈالوں گی۔اس کا خون پی لوں گی!''۔

اچانک سجو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے پیچھے سے نکل بھاگا۔ بھابی چیل کی طرح اس کے پیچھے جھپٹیں۔

''بھاگتا ہے' بھگوڑے! بھاگ' کتنی دور بھاگے گا؟ میں بھی سمجھ لوں گی تجھے''۔

بھابی کے پیچھے میں دوڑا۔کمرے سے کمرا۔پھر کمرے سے دالان' دالان سے دیوان خانہ' دیوان خانہ سے صحن' صحن سے پھر دالان۔سارے گھر میں بھابی اور سجو کی ریس ہو رہی تھی۔ بھابی اپنے ذرا تندرست جسم کو لئے ہانپ ہانپ کر بھاگ رہی تھیں۔

''مجھے دوڑاتا ہے۔ مجھے دوڑاتا ہے۔ اچھا نالائق !ہاتھ تو لگ آج' اچھی طرح دیکھ لوں گی۔

یکا یک سجو کا رخ باہر کے دروازے کی طرف پلٹا۔اس سے پہلے کہ سجو دروازہ کا پردہ اٹھا باہر نکل جاتا' بھابی نے موقع محل کی نزاکت دیکھتے ہوئے ہاتھ کی لکڑی پوری قوت سے پھینک ماری۔مگر پردہ سجو کے لئے ڈھال بن گیا۔حسب معمول سجو صاف بچ گیا۔اور لکڑی پردے میں اٹک کر لٹکنے لگی۔ بھابی باہر تو جا نہیں سکی تھیں۔وار خالی جانے کا رنج الگ۔مجبوری کی حالت میں کوسنے بیٹھ گئیں۔

''مجھے ستانے والا مر جائے' کوئی سکھ نہ دیکھے۔غیب سے گولی لگ جائے''۔

ابھی بھابی کی دعائیں ادھوری ہی تھیں کہ سڑک پر سے سجو کی چیخ سنائی دی۔میں باہر کو دوڑ پڑا۔سجو مخالف سمت سے آنے والی ایک سائیکل کی زد میں تھا۔گلی میں چھ سات آدمی بھی جمع ہو گئے تھے۔سجو کے ہاتھ اور پیر پر معمولی سی خراشیں آئی تھیں۔مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے چلاّ چلاّ کر رونا شروع کر دیا۔اور سائیکل والا میری پوچھ گچھ سے پہلے ہی اپنی صفائی میں بولنے لگا۔

''دیکھئے جناب میں نے گھنٹی بھی بجائی مگر بچہ اس قدر بے تحاشہ دوڑتا چلا آرہا تھا کہ۔۔۔آپ یقین جانئے میرا کوئی قصور نہیں ہے''۔

بات بھی سچ تھی۔اس لئے معاملہ رفع دفع کر کے میں سجو کو اٹھا گھر لے آیا۔ بھابی نے لپک کر سجو کو مجھ سے ایسے چھین لیا جیسے عرصہ سے جدا رہی ہوں۔اور سینے سے لپٹا کر لگیں رونے۔ روتی جاتی تھیں اور سائیکل والے کو کوستی جاتیں تھیں۔

''سائیکل پر بیٹھ کر اپنے آپ کو لاٹ صاحب کی اولاد سمجھ لیا ہے۔انسان کیسے نظر آئے؟ اندھا کہیں کا! ہائے کسی کا کیا جاتا۔میری گود اُجڑ جاتی۔میرا بچہ' میرا لال۔میرا چاند۔۔۔و بے اختیار سجو کو پیار کرنے لگیں۔

اور میں چپ چاپ ایک کونے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک بھابی کے دو الفاظ گونج رہے تھے جو انہوں نے کچھ ہی دیر پہلے کہے تھے۔ مجھے ستانے والا مر جائے کوئی سکھ نہ دیکھے' غیب سے گولی لگ جائے۔

خاموشی

ایک عقل مند نوجوان داناؤں کی محفل میں کبھی بیٹھتا تو بحث و تکرار سے ہمیشہ الگ رہتا۔ایک دفعہ اس کے بات نے کہا ''برخوردار! تم داناؤں کی مجلس میں گونگوں کی طرح چپ چاپ کیوں بیٹھے رہتے ہو؟''عقل مند نے عرض کی''قبلہ اس اندیشے سے کہ مجھ سے کوئی ایسی بات نہ پوچھی جائے جس کا جواب نہ دے سکوں اور خواہ مخواہ شرمندگی حاصل ہو''۔

☆ کسی کو اچھے عمل سے دلی خوشی دینا ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔ حکایات شیخ سعدی شیرازیؒ

ثریا جبین

پچھتاوے کی آگ

میں ایک عدد بیوی کا شوہر ہوں۔ یوں تو میں چار بھی کرلوں تو کون مجھے روکے گا۔ بحرحال میں ہوں تو بیوی سے برتر۔ یہ بات میں اسے بار بار ذہن نشین کرواتے رہتا ہوں، میرا حکم سننا اس کا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میری ہر بات بے چوں چرا مان لیتی ہے۔ چپ چاپ وہ میرے حکم کی تعمیل کرتی ہے کیونکہ بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں اس کا حاکم ہوں۔ اس کی شکم پوری کرتا ہوں مجھے پورا حق ہے کہ اُسکو اپنے کنٹرول میں رکھوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ ذرا میں نے ڈھیلی ڈوری چھوڑی تو پھر مجھے اس کے ماتحت رہنا پڑے گا۔

بیوی کی ڈیوٹی ہے بلکہ ذمہ داری ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر گھر کی صفائی کرے۔ گھر کے لوگ بیدار ہوتے ہی انہیں چائے ناشتہ پیش کرے۔ جب وہ کچن میں مصروف ہوتی ہے تو مجھے کچھ کام یاد آتا ہے میں اسے آواز دیتا ہوں میرے جوتے موزے اس نے سلیقے سے رکھے ہیں پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے بیٹھی جگہ پر ہر چیز مہیا کرے۔ ابھی وہ میرا کام پورا کر بھی نہیں پاتی کہ ماں کی آواز آتی ہے۔ ارے بہو، کہاں مرگئی۔ مجھے دودھ دینا تو تو ہمیشہ بھول جاتی ہے۔ اگر تیرے دل میں میرا کام کرنا نہیں ہے تو نہ کر۔ میں خود اپنا کام کرسکتی ہوں۔ میں کوئی لاچار نہیں ہوں۔ اور بھی بہت ساری صلواتیں سناتی۔

بہو بھاگ کر دودھ لینے چلی جاتی ہے۔ پھر بچے تو بچے بڑے بھی ناشتہ کے لئے چلاتے ہیں۔ وہ بھاگ بھاگ کر یہ کام پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس پر بھی بعض وقت جوتوں کو پالش کرنا یا کپڑوں کو پریس کرنا بھول جاتی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ خوب جلی کٹی سناتا ہوں۔ میرے ساتھ میری ماں بھی شریک ہوجاتی ہے۔ ہم دونوں ماں بیٹے مل کر اس کے خاندان کو گن دیتے ہیں۔ ماں کہتی، توبہ توبہ ایسی ایدی کندہ بہو کو لاکر میں تو پچھتا رہی ہوں۔ نہ تو جوڑے کی رقم ملی اور نہ ہی جہیز ہی ڈھنگ کا ملا۔ میرے بیٹے کی تو قسمت پھوٹ گئی۔ کیسے کیسے گھرانوں سے رشتے آتے تھے۔ بعض لوگ تو ذاتی مکان بھی دینے تیار تھے۔ لیکن نصیب میں تو یہی کمبخت ماری لکھی تھی۔ یہ سن کر مجھے اور بھی پچھتاوا ہونے لگتا۔ اسکوٹر کی مجھے کتنی خواہش تھی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ ملے نہ ملے۔ موٹر سیکل تو ضرور ملے گی۔ مگر افسوس۔ میری ساری خواہشات پر پانی پھر گیا۔ نہ ڈھنگ کا فریجر، نہ نقد رقم، آخر اس بیکار عورت کو لے کر کیا کروں۔ اب وہی چپل گھسڑتے ہوئے بس کی لائن میں ٹھہرنا۔ ان سب کی ذمہ دار میری بیوی ہے۔ جب بھی مجھے آفس کو دیر ہوتی ہے بیوی پر شدید غصہ آتا ہے۔

یوں تو میں ٹھنڈا مزاج کا آدمی ہوں۔ میرے آفس اور جان پہچان کے لوگ مجھے بے حد نرم مزاج اور کم سخن سمجھتے ہیں۔ باہر تو میں بڑے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ دراصل نرم مزاجی، کم سخنی اور اخلاق کو میں نے باہر کی دنیا تک محدود رکھا ہے۔ گھر آتے ہی میرا رویہ بدل جاتا ہے۔ بیوی کی صورت دیکھتے ہی کم اپنی مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اب بیوی لاکھ خدمت کرے میرے مزاج ہی نہیں ملتے۔ اُس کی سادگی کو میں مکاری، اُس کی خدمت کو میں ڈھونگ سمجھتا ہوں۔ یہ سب میں جان بوجھ کر کرتا ہوں۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اس پر طنز کرنے سے باز نہیں آتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس سے جھگڑتا رہتا ہوں۔ اُسے بُرا بھلا کہنے سے مجھے دِلی تسکین ملتی ہے۔ اپنے برتر ہونے کے احساس کو میں اس پر ہمیشہ حاوی رکھتا ہوں۔

''اگر کبھی وہ میکے جانے کے لئے کہے تو مجھے اس کو ذلیل کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ پہلے تو میں اس کے میکے والوں میں خوب عیب نکالتا ہوں۔ پھر ماں کہتی ہے۔ ٹھیک ہے جانے دو۔ لیکن اپنے بابا سے کہہ کر موٹر سیکل کا بندوبست کرلینا۔ دیکھتی نہیں میرے بیٹے کو آفس

انشائیہ

جانے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے؟ تم کیسی بیوی ہو؟ اپنے شوہر کی تکلیف کا ذرا خیال نہیں''۔ میں بھی ڈھٹائی میں ہاں سے ہاں ملاتا ہوں۔

بیوی رورو کر کہتی ہے۔''میرے ماں باپ کی مالی حیثیت نہیں ہے کہ وہ موٹر سیکل کا انتظام کریں۔ ابھی تو انہیں میری دو بہنوں کی شادی بھی کرنا ہے۔ ان کے جہیز کا انتظام کرنا ہے۔ کہاں سے کریں گے وہ یہ سب۔!''

''بس بس زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔ کیا ہم نے تمہاری بہنوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہم کو تو اپنے بیٹے کے لئے موٹر سیکل چاہئے۔ تمہاری بہنوں کی شادی سے ہمیں کیا لینا دینا۔ بس میں نے کہہ دیا کہ موٹر سیکل جلد سے جلد آنا چاہئے''۔

میری بیوی غمزدہ ہوکر میکے جانا ملتوی کر دیتی ہے۔ لاکھ مجھے سمجھاتی ہے کہ میرے ماں باپ اس موقف میں نہیں ہیں۔ لیکن میں اُس کی بات ماننے تیار نہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے میرے دوست کی شادی ہوئی۔ حالانکہ وہ صرف ایک کلرک ہے۔ اس کے باوجود اس کے سسرال والوں نے بے حساب جہیز دیا۔ گھر کی ضروریات کے علاوہ۔ ٹی۔ وی، فریج، کولر، گیزر، واشنگ مشین، صوفہ سیٹ، ڈائننگ ٹیبل وغیرہ وغیرہ۔ ایک سے اعلیٰ ایک سامان۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت پلسر گاڑی۔ ایک طرف ناز و انداز سے کھڑی تھی۔

اس کلرک کے مقابلے میں تو میری حیثیت کتنی بڑی ہے۔ اچھی پوسٹنگ پر ہوں۔ مکان بھی میرا ذاتی ہے۔ جبکہ وہ کلرک کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ پھر بھی میری قسمت کہ مجھے کچھ نہیں ملا' سوائے معمولی سامان کے۔ جوڑے کی رقم تو ہم نے شادی سے پہلے زبردستی لے لی تھی۔ ورنہ وہ بھی نہ ملتی۔ مجھے اس کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ ایسے سسرال والوں کے تو پاؤں دھوکر بھی پئیں تو کم ہے۔ بدقسمتی تو میرے حصے میں آئی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ فقیری خاندان کی لڑکی ہے۔ زندگی بے مزہ ہوگئی۔ لوگ تو لڑکی کے میکے والوں سے کیا کیا آس لگاتے ہیں۔ میں نے تو صرف موٹر سیکل مانگی تھی۔ وہ بھی دینے کے لئے سو سو بہانے بناتے ہیں۔

اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اگر اُن لوگوں نے موٹر سیکل جلد نہ دلائی تو میں ان کی بیٹی کو ان کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ ایسی بے کار شئے کو گھر میں رکھنے کا کیا فائدہ۔؟

ہم دونوں ماں بیٹا اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ اپنی بدنصیبی پر سوائے افسوس کرنے کے ہم کیا کر سکتے تھے۔ ماں تو اٹھتے بیٹھتے اسے طعنے دیتی رہتی۔ لیکن وہ بھی کس مٹی کی بنی تھی۔ جواب ہی نہ دیتی۔

جب ماں نے دیکھا بہو کسی صورت میکے سے موٹر سیکل کا بندوبست نہیں کر سکتی تو اُس نے خوفناک منصوبہ بنایا۔ کچن میں میری بیوی پکوان میں مصروف تھی۔ میری ماں آہستہ سے کچن میں داخل ہوئی اور خلاف معمول بڑے پیار سے بہو سے باتیں کرتے کرتے آہستہ سے اُسکے پلو کو دیا سلائی دکھائی۔ وہ پکوان میں منہمک تھی۔ اُسے جب تیز آنچ کا احساس ہوا تو وہ فوراً پلٹی' ماں وہاں سے کھسکنے ہی کو تھی بہو نے دوڑ کر ماں کو جکڑ لیا۔ ماں چلاّنے اور اپنے آپ کو چھڑانے لگی۔ لیکن آگ کی لپٹ میں وہ بھی آچکی تھی۔ تمام گھر والے دوڑے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میری اکڑی ہوئی گردن ندامت کے بوجھ سے جھک گئی۔ ماں کے اس گناہ میں، میں بھی برابر کا شریک تھا۔ روپیہ، پیسہ، جہیز اور اسکوٹر کے لالچ میں، میں نے اپنی بیوی کی جان لے لی۔ قدرت نے مجھے دوہری سزا دی۔ ماں اور بیوی دونوں سے محرومی کا احساس اور دُکھ مجھے زندگی بھر رہے گا۔ کاش میں ماں کی باتوں میں نہ آیا ہوتا۔ میری بیوی میرے لالچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ رات دن مجھے چین حاصل نہیں۔ سکون کے لئے میں ترستا ہوں۔ رات میں جب سوتا ہوں تو اچانک وہ میرے آکھڑی ہوتی ہے اور پوچھتی ہے، بتاؤ میرا قصور کیا ہے؟ کیا غریب ہونا بہت بڑا قصور ہے؟ تم نے مجھے مار ڈالا۔ اب تم بھی کبھی چین کی نیند سو نہ سکو گے۔

افسانے

میں چونک کر اٹھ جاتا ہوں۔ میرا چین میرا سکون سب ختم ہوگیا۔ افسوس اب وہ وقت واپس آنے والا نہیں کہ میں اپنے گناہوں کی تلافی کرلوں۔ میں بڑا بدنصیب انسان ہوں۔ اتنی نیک اور خدمت گزار بیوی کی میں نے قدر نہ کی۔ ہر پل اس کو ذہنی تکلیف دیتا رہا۔ بدلے میں اُس نے مجھے سے کبھی کوئی شکایت نہ کی۔ ماں نے اس پر مظالم ڈھائے۔ لیکن اس نے اف نہ کی۔

اب آنکھ کھلی بھی تو کب؟ جب کچھ باقی نہ رہا۔ پل پل ضمیر کچھوکے لگاتا ہے۔ وہ تمام مظالم یاد آتے ہیں۔ جو میں نے اس نیک بخت پر کئے تھے۔ اسکی خاموشی کو میں اس کی مکاری سمجھتا تھا۔ کیوں میں نے اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دی!۔

اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ پچھتاوے کی آگ مجھے زندگی بھر جینے نہیں دے گی۔

''سکوں کیوں کر ملے بتلایئے کیسے قرار آئے
خیال عہد ماضی جب کہ دل میں بار بار آئے''

ثریا جبین
فلیٹ نمبر B-7 گرین منشن اپارٹمنٹ
10-3-276/277 ہمایوں نگر، حیدرآباد (تلنگانہ)

خوشبودار باتیں

☆ زیادہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

☆ دوسروں کے آنسوؤں کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کرلینا انسانیت کی معراج ہے۔

☆ نیک بننے کی کوشش کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔

☆ اعتماد وہ شیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں بنتا۔

☆ جو یہ کہے کہ اس کی بات سچی ہے تو اس کی ہر بات جھوٹ ہوگی۔

بیان تفصیلات وملکیت بابتہ
ماہنامہ ''قومی زبان'' حیدرآباد
فارم 4، رول نمبر 8
RNI REGN.: TELURD/2015/32622

۱۔ مقام اشاعت : دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳۔ نام طابع : ڈاکٹر محمد غوث

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۴۔ نام ناشر : ڈاکٹر محمد غوث

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۵۔ نام ایڈیٹر : ڈاکٹر محمد غوث

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۶۔ ان افراد کے نام اور پتے جو رسالے کے مالک اور شرکاء یا حصہ دار ہیں اور جن کا حصہ جملہ سرمایہ کا ایک فیصد ہو: کوئی نہیں

منکہ طابع، ناشر وایڈیٹر ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کی حدتک صحیح ہیں۔

مورخہ: یکم مارچ 2021
ڈاکٹر محمد غوث
ایڈیٹر، ناشر وطابع

انشائیہ

کرونا ویکسین اور جسم کا قدرتی نظام

ہمارے جسم کا مدافعتی نظام دو طریقوں سے کام کرتا ہے۔ جب کوئی وائرس جسم میں داخل ہوتا ہے تو یہ مدافعتی نظام اپنی چھریاں، چاقو تیز کر لیتا ہے اور اُس وائرس سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، مدافعتی نظام کے خلیے (سیلز) وائرس کو ناکارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں جسم کو بخار ہو جاتا ہے، جو دراصل وائرس کے لئے ناسازگار ماحول کا باعث بنتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے جسم کے ''ہمدرد'' خلیے کچھ کیمیائی مادوں سے بھی وائرس کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدافعتی نظام کا یہ دفاعی حربہ اکثر وائرس کو بھگانے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے، مگر کچھ وائرس ڈھیٹ ہوتے ہیں اور وہ اس پہلی دفاعی لائن کو توڑ کر بچ نکلتے ہیں، اُن کے لئے ہمارے جسم کے پاس ''پلان بی'' ہوتا ہے۔ قدرت نے ہمارے جسم میں ٹی سیل اور بی سیل رکھے ہوئے ہیں، ٹی سیل کی دو قسمیں ہیں، ایک کو مددگار کہہ لیں اور دوسرے کو ''قاتل''۔

دوسرے مرحلے میں بی سیل وائرس سے نبرد آزما ہوتا ہے اور جسم میں ضد جسم (اینٹی باڈی) پیدا کرتا ہے، تاکہ پہلے سے موجود مدافعتی نظام کے لئے وائرس کو مارنا ممکن ہو جائے، جب کہ قاتل ٹی سیل اُن خلیوں کو ختم کرتا ہے، جنھیں وائرس متاثر کر چکا ہوتا ہے، چونکہ ان خلیوں میں وائرس ''گھس'' چکا ہوتا ہے، اس لئے انھیں مارنا ضروری ہوتا ہے اور ٹی سیل باقی ''شریف اور تابعدار'' قسم کے خلیوں کو مارے بغیر یہ کام نہایت چابک دستی سے کرتا ہے۔

اس پورے عمل کی سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب ہمارا جسم اپنے اس دہرے مدافعتی نظام کی مدد سے وائرس کو ختم کر دیتا ہے تو وہ ''یادداشت کے خلیوں'' میں وائرس کی جنگ سے متعلق یہ تمام باتیں محفوظ کر لیتا ہے، اسی لئے آئندہ جب وہی وائرس دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے تو پھر ہمیں اتنا تردد نہیں کرنا پڑتا، ہمارا جسم فوری طور پر وائرس کو ناکارہ کر دیتا ہے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا کہ ہم کیسے محفوظ ہو گئے۔

اسے ''ایمیونٹی'' یا قوت مدافعت کہتے ہیں اور ویکسین یہی قوت مدافعت پیدا کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کورونا وائرس کے باب میں ہمارے جسم کی قدرتی قوت مدافعت کو کیا ہوا اور سائنسی لیبارٹری میں بننے والی ویکسین کیسے کام کرے گی؟

دنیا میں اب تک آٹھ کروڑ سے زیادہ لوگ کورونا وائرس کا شکار ہو چکے ہیں، ان میں مرنے والوں کی تعداد 18 لاکھ سے بھی زیادہ ہے، زیادہ تر لوگ اپنی قدرتی قوت مدافعت کی بدولت ہی صحت یاب ہوئے، اُن کے جسم میں ٹی اور بی سیل نے کام کیا، وائرس کو مار بھگایا اور پھر اپنے خلیوں میں یہ معلومات محفوظ کر لیں، یہی وجہ ہے کہ کم از کم مستقبل قریب میں انھیں کورونا وائرس ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے، اسی کو ضد جسم بننا کہتے ہیں۔

کورونا وائرس کے جو مریض زیادہ شدت سے اس کا شکار ہوئے، انھیں میڈیکل سائنس اور بروقت طبی امداد اور جدید سہولیات نے بچا لیا، خطرناک بات اس وائرس کی یہ ہے کہ شدید نوعیت کے کیسوں میں، بحالی صحت کے بعد بھی، اس کے اثرات رہتے ہیں اور بدن میں نقاہت اور کمزوری کے علاوہ دیگر اعضا کو نقصان پہنچنے کا احتمال رہتا ہے، ویکسین یہ کام کرے گی کہ اس وائرس کا جنیاتی مواد انسانی جسم میں داخل کرے گی، جس میں اصل وائرس کے اجزاء شامل نہیں ہوں گے، ہمارا جسم اُسے وائرس سمجھ کر اپنے مدافعتی نظام کو جاری کر دے گا اور ٹی سیل اور بی سیل فوراً اُسی طرح ''مسلح'' ہو جائیں گے، جیسے کسی وائرس نے حملہ کر دیا ہے۔

یہ معلومات یادداشت کے خلیوں میں محفوظ ہو جائیں گی اور جب کورونا وائرس کا حملہ ہوگا تو ان معلومات کا استعمال کرتے ہوئے ہمارا مدافعتی نظام وائرس کو مار بھگائے گا، کیونکہ اُس وقت یہ وائرس ہمارے جسم کے لئے انوکھا نہیں رہے گا۔ اب کچھ لوگوں کو یہ وہم ہے کہ خواہ مخواہ جسم میں ''غیر فطری'' جنیاتی مادے کا ٹیکہ کیوں لگوایا جائے؟ ویکسین کے ذریعے ہمارے جسم میں سرے سے کوئی غیر فطری مادہ نہیں ڈالا جاتا، بلکہ اس طرح سے ''ناکارہ وائرس'' شامل کیا جاتا ہے، تاکہ جسم کو ممکنہ صورت حال میں اصل وائرس سے مقابلے کے لئے تیار کیا جا سکے۔ ایک مرتبہ جب ویکسین کے ذریعے ہمارا جسم یہ سیکھ جاتا ہے کہ اس وائرس کو کیسے برباد کرنا ہے تو پھر ویکسین کا کام ختم ہو جاتا ہے، ویکسین ہمارے جسم میں نہیں رہتی، صرف وائرس سے نمٹنے کا طریقہ یادداشت کے خلیوں میں رہ جاتا ہے، اسی عمل کو ویکسی نیشن (Vaccination) کہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہر ویکسین کے مضمرات ہوتے ہیں اور ہر ویکسین بیماری سے بچاؤ کی سو فیصد ضمانت نہیں ہوتی، مگر اس دنیا میں کسی بھی چیز کی سو فیصد ضمانت نہیں، کیونکہ انسانی جسم اس کائنات کی طرح پُراسرار ہے اور سائنس انھی اسرار سے پردہ اُٹھانے کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ویکسین سائنسی طریقہ کار کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

یاسر پیرزادہ

ماخوذ از اُردو پوائنٹ

تاریخ اشاعت: 19-02-2021

حفظانِ صحت

آپ اپنے آپ کو کیسے فٹ رکھ سکتے ہیں

آج ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ آپ مختلف عمر میں خود کو کس طرح فٹ رکھ سکتے ہیں، یہ کوئی مشکل کام نہیں۔سب سے پہلے تو بچے کی اچھی صحت بچپن کی خوراک پر منحصر ہے۔ بچے کے لئے ماں کا دودھ انتہائی ضروری ہے اس سے ہڈیاں مضبوط اور جسم طاقتور ہوتا ہے۔اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو اچھی قسم کا دودھ پلایا جائے کیونکہ اسی عمر میں ہڈیوں کی مضبوطی جوانی میں بھی کام آتی ہے۔

جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے اسے متحرک رکھنے کی ضرورت ہے۔گھر کے اندر اور باہر کھیلنے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔آؤٹ ڈور گیمز بہت ضروری ہیں اس سے وزن بھی بہتر ہوتا ہے اور بچہ بھی چست و توانا رہے گا۔بچوں کے ساتھ خود بھی کھیلیں، پوری فیملی کے ساتھ کوئی فن کرنے سے بچے جسمانی اور ذہنی طور پر توانا ہوتے ہیں مثلاً کسی اونچائی پر چڑھنے کی کوشش کیجئے۔

رکاوٹیں دور کرنے کی کوشش کریں۔پارکوں میں ایڈونچر کیجئے یا ایسی کوئی سرگرمی بھی ہو سکتی ہے۔بچوں کا وزن نہیں بڑھنا چاہئے، بچپن میں بڑھنے والا وزن کئی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے چنانچہ ورزش بھی ضروری ہے۔ضرورت پڑنے پر فزیوتھراپسٹ سے بھی رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

18 سے 35 سال کی عمر میں: اس عمر میں نوجوان عملی زندگی میں داخل ہوجاتا ہے۔

اس عمر میں لائف اسٹائل یکسر بدل جاتا ہے، بچپن کی آسان زندگی ختم ہوجاتی ہے اور ایک انتہائی اچھے مستقبل کے لئے دن بھر کا مصروف شیڈول نوجوان کی میز پر پڑا رہتا ہے۔اس عمر میں بہت زیادہ کھیل کود کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اس عمر میں یونیورسٹیوں، کالجوں اور نوکری جیسی اہم منزلیں نوجوانوں کے سامنے ہوتی ہیں، اس کے لئے کام کیجئے۔

35 سے 60 سال کی عمر میں:

یہ عمر کئی حوالوں سے پریشان کن ہوتی ہے۔

شادی کے قرضے چکانا پڑتے ہیں۔ بچے کی فیسیں دینے کے لئے ادھار لینا پڑتا ہے یا گھر چلانے کے لئے مزید پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔بینک سے چند منٹوں میں گاڑی تو مل جاتی ہے۔لیکن قسطوں کی ادائیگی 24 گھنٹے سر پر سوار رہتی ہے۔اس سے بچپن اور جوانی کی سرگرمیاں یکسر ختم ہو جاتی ہیں۔ پریشانیاں اور تنہائیاں ایسے نوجوانوں کا مستقبل ہوتی ہیں۔وزن بڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔

نظام ہاضمہ سست پڑ جاتا ہے اور نوکری دکھائی دینے لگتی ہے۔سائنسدانوں نے اس کا بھی حل بتایا ہے۔کم از کم 20 سے 30 منٹ تک ہفتے میں دو تین مرتبہ تیز قدموں سے واک کیجئے، اس سے چستی بھی پیدا ہوگی اور فٹنس بھی رہے گی۔

61 سال سے زائد عمر میں:

60 سال کی حد کو پار کرنے والوں کیلئے کسی بھی قسم کی ورزش کرنا آسان نہیں۔کیونکہ پٹھے کمزور پڑنا شروع ہوجاتے ہیں۔

یاد رکھیے استعمال نہ ہونے والے اعضاء بیمار ہوسکتے ہیں۔لہٰذا گھر کے اندر ہی کوئی ہلکی پھلکی ورزش کیجئے۔وزن اٹھانے والی ورزش بہترین ہے۔اس سے پھیپھڑے اور گھٹنوں کی ہڈیاں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔اگر ممکن ہو تو یوگا کی کوئی کلاس لے لیجئے۔ٹانگوں کو مضبوط رکھنے کے آسان ترین طریقہ انہیں متوازن رکھنا ہے۔ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کی ورزش بھی کیجئے۔

آپ کسی میز یا دیوار کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔باری باری دونوں ٹانگوں پر روزانہ ایک دفعہ کھڑے رہنے سے ٹانگوں کی ہڈیاں ٹھیک رہیں گی۔اگر یہ ورزش ریلیف نہ دے تو پھر روزانہ کیجئے۔اور اگر ممکن ہو تو کسی دیوار کے سہارے باری باری ایک ٹانگ پر کھڑے ہوتے وقت آنکھیں بھی بند رکھیے۔آنکھیں بند کرنے سے دماغ کو سکون ملتا ہے۔اس سے کولہے اور پنڈلیوں میں غیر معمولی قوت پیدا ہوگی۔اس کے علاوہ ہلکی پھلکی ورزش کرسکتے ہیں، یہ ورزشیں ہونے سے پہلے ضرور کرلیجئے۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کسی بھی وقت گرنے کی صورت میں ہڈیاں اتنی مضبوط ضرور ہوں گی کہ فریکچر نہیں ہوں گی۔

ڈاکٹر محمد آصف

لہسن کے فوائد

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ لہسن نہ صرف دل بلکہ کینسر کے خلاف بھی بہت مفید ہے۔لہسن نا صرف کولیسٹرول کو نارمل کرنے اور دل کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں مفید ہے بلکہ اسے کھانے سے مختلف اقسام کے کینسر سے بھی محفوظ رہا جاسکتا ہے۔بتایا جاتا ہے کہ لہسن سب سے زیادہ معدے کے کینسر کے خلاف موثر ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جولوگ باقاعدگی سے اپنی خوراک میں لہسن کا استعمال کرتے ہیں ان میں بڑی آنت کے کینسر کے خطرات پینتیس فیصد تک کم ہوجاتے ہیں۔

تحقیق کے مطابق لہسن امراض قلب، بلڈ پریشر سے بچاتا ہے۔ایک تحقیق کے مطابق لہسن خون کی رگوں میں مواد کو جمنے سے روکتا ہے۔لہسن کا استعمال مشرق و مغرب دونوں غذائی ثقافتوں میں پایا جاتا ہے۔

آسٹریلیا کے ڈاکٹروں نے بلڈ پریشر کے پچاس مریضوں پر ایک تجربہ کیا۔ان کو لہسن کے کیپسولز کھلائے' ان مریضوں کے بلڈ پریشر کا تقابل ہائی بلڈ پریشر کے اُن مریضوں کے بلڈ پریشر سے کیا گیا جو ادویات کا استعمال پابندی سے کرتے ہیں۔

پتہ یہ چلا کہ روزانہ لہسن کے چار کیپسولز کا استعمال کرنے والے مریضوں کا فشار خون یا بلڈ پریشر ادویات کا استعمال کرنے والوں کے مقابلے کہیں نیچے تھا۔برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن کے محققین نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں مزید ریسرچ کی ضرورت ہے۔

لہسن میں کئی مفید وٹامنز کے علاوہ کیلشیم، فاسفورس، آئرن، آیوڈین، کوبالٹ، زنک، سوڈیم، پوٹاشیم، سیلینیم جیسے معدنی اجزاء موجود ہوتے ہیں۔

ماخوذ از اُردو پوائنٹ

تاریخ اشاعت: 27-02-2021

غزلیں

شاہ حسین نہری۔ اورنگ آباد

بولنے کی جا نہیں
میں نے دیکھا کیا نہیں
دل تو سیلاب تھا
اشک اک ڈھلکا نہیں
بعد اُس کے پھر کبھی
دل مرا بہلا نہیں
دیکھنا تھا اُس کو، میں
چپ رہا، بولا نہیں
خاطر نسیاں میں وہ
یاد ہے، آیا نہیں
اب بھی ہوں بازار میں
کل کا میں سکہ نہیں
پہلے پن کی دوڑ میں
شاہؔ کا سایہ نہیں

oOo

موبائل نمبر 09225303313

جمیلؔ نظام آبادی

اپنی نظروں میں جو تولوگے تو پاؤگے مجھے
دل کی آنکھیں کبھی کھولوگے تو پاؤگے مجھے
میں محبت کی طرح رہتا ہوں دل میں سب کے
اپنے دل کو جو ٹٹولو گے تو پاؤگے مجھے
روبرو آپ کے رہتا ہوں کہ آئینہ ہوں
شوق کی آنکھ جو کھولوگے تو پاؤگے مجھے
یہ اگر سچ ہے کہ رہتا ہوں میں خوابوں میں تو پھر
در ذرا خواب کے کھولوگے تو پاؤگے مجھے
کتنے ہی رنگ فضاؤں میں ہیں بکھرے ہر سو
زیست میں رنگ یہ کھولوگے تو پاؤگے مجھے
صورتِ درد میں رہتا ہوں جگر میں دل میں
اپنی آنکھوں کو بھگولوگے تو پاؤگے مجھے
پھول جھڑتے ہیں اگر آپ کے منہ سے تو پھر
میرے بارے میں بھی بولوگے تو پاؤگے مجھے
مجھ کو پالینا نہیں ہے کوئی مشکل بھی جمیلؔ
خود میں مجھ کو جو سمولوگے تو پاؤگے مجھے

oOo

مکان نمبر 9-19-64/A
محلّہ مالاپلی۔ نظام آباد 503001 (تلنگانہ)

حصہ نظم

جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس کی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر ترقی اور دوبارہ اقلیتی بہبود کے ڈائرکٹر کا جائزہ حاصل کرتے وقت لی گئی تصویر میں
مسٹر ناگراج سنگھ ڈپٹی ڈائرکٹر کمشنریٹ اقلیتی بہبود اور محمد عبدالسمیع لائزن آفیسر دیکھے جاسکتے ہیں

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر خواجہ شوق ہال' اردو مسکن' خلوت میں ایک ادبی اجلاس منعقد کیا گیا
جس میں اساتذہ و ماہرین اردو نے شرکت کی ۔تصویر میں جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری اردو اکیڈیمی' محترمہ پروفیسر فاطمہ پروین' ڈاکٹر عابد معز'
پروفیسر نسیم الدین فریس' پروفیسر فضل اللہ مکرم' ڈاکٹر فاروق طاہر' جناب سردار سلیم و دیگر احباب دیکھے جاسکتے ہیں

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY | Vol.06 | No.3 | March-2021

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

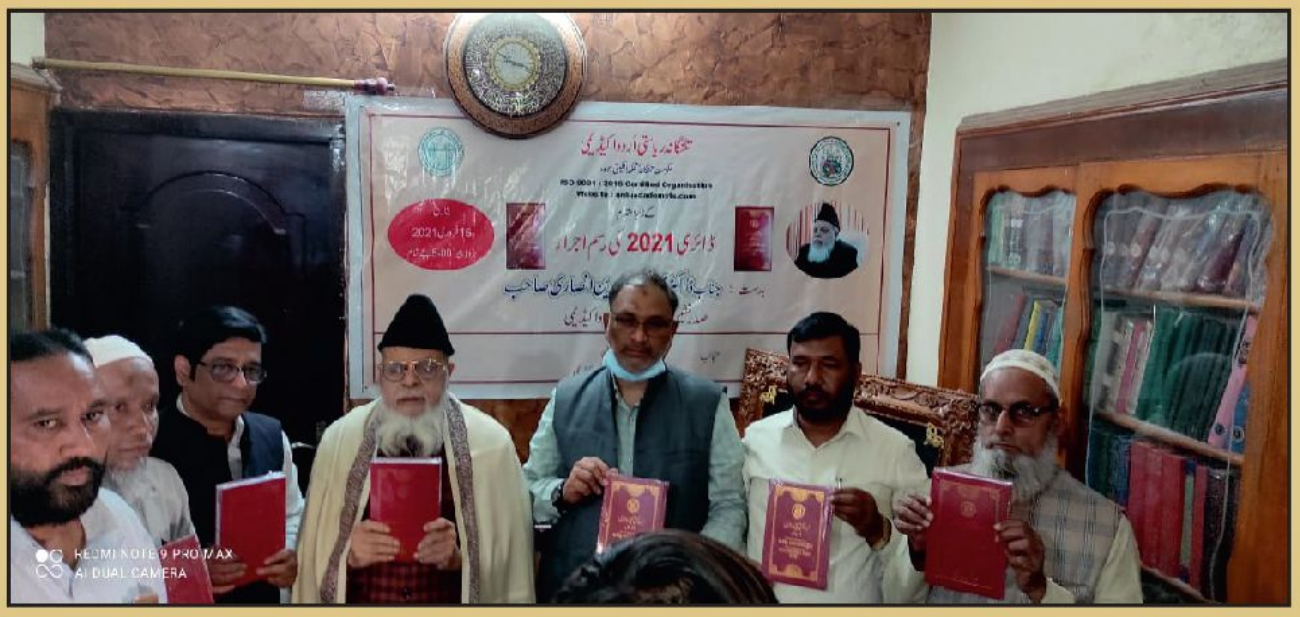

ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صدر نشین تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے اردو اکیڈیمی کی سال 2021 کی ڈائری کی رسم اجراء انجام دی۔
اس موقع پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اور عہدیداران اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website: urduacademyts.com

غزلیں

سردار سلیم

ضبط جذبات سے یہ جسم امس جاتا ہے
ابر نیساں کہیں جنگل میں برس جاتا ہے
اتنی چنگاریاں لپٹی ہیں مری پلکوں سے
خواب آنکھوں میں اترتے ہی جھلس جاتا ہے
اشک بہتے ہیں تو کم ہوتی ہے زخموں کی جلن
یہ وہ پانی ہے جو شعلوں کو بھی ڈس جاتا ہے
اوب جاتا ہے مرا دل جو غمِ دنیا سے
تیری یادوں کے پرستان میں بس جاتا ہے
رات کے ہاتھ گلابی سے ہوئے جاتے ہیں
چاند چھلکاتے ہوئے پیار کا رس جاتا ہے
آہ اس دور تباہی کا وہ سقراط ہوں میں
زہر پینے کے لئے بھی جو ترس جاتا ہے
اس طرف کوئی نہیں گہری خموشی کے سوا
جس طرف سلسلۂ تار نفس جاتا ہے
کس کے روکے سے رکا ہے دل دیوانہ سلیم
یہ پرندہ تو سدا سوئے قفس جاتا ہے

oOo

18-8-223/12/A
سردار میڈیکل اسٹور، ریاست نگر، حیدرآباد

علیم پرواز

منقش چھت حسیں دیوار ودر میں کچھ نہیں رکھا
مکیں سے ہو مکاں خالی تو گھر میں کچھ نہیں رکھا
بجز سوزِ دروں قلب و جگر میں کچھ نہیں رکھا
نہ ہو سر میں کوئی سودا تو سر میں کچھ نہیں رکھا
گرہ میں کچھ نہیں باندھا کمر میں کچھ نہیں رکھا
بجز نامِ خدا سامان گھر میں کچھ نہیں رکھا
وہی دولت ہے اپنی خرچ ہو جو فی سبیل اللہ
وگرنہ درحقیقت مال و زر میں کچھ نہیں رکھا
محبت سے جو دل جیتے وہی ہے فاتح عالم
جو قتلِ عام ہو فتح و ظفر میں کچھ نہیں رکھا
وہ جو ہیں جاہلِ مطلق یہاں سکوں میں تُلتے ہیں
نہ جانے رب نے کیوں دستِ ہنر میں کچھ نہیں رکھا
قدم بوسی کو منزل کیوں نہ آئے گی کہ جب ہم نے
بجز ذوقِ سفر زادِ سفر میں کچھ نہیں رکھا
بغیرِ طاقتِ پرواز شاہیں بھی مملا ہے
بظاہر خوب صورت بال وپر میں کچھ نہیں رکھا

oOo

13-6-825/A/20، مہدی کالونی، لنگر حوض روڈ
نزد پلر نمبر 102 حیدرآباد 500 008

حصہ نظم